نصرت ظہیر

بقلم خود

نصرت ظہیر

اسکائی گروپ

167/7، جولینا کمرشیل کمپلیکس، نئی دہلی۔ 110025

فون: 6913525-6914598

اعتماد ہے جو قوموں کے تہذیبی شعور کو ان کی زبان و ادب کی رعنائیوں کو آب و تاب بخشتا ہے اور انہیں مدفون ہونے سے بچاتا ہے۔

نصرت ظہیر کی اس کاوش کو اسی ضمن میں شمار کرتا ہوں۔ اور سب باتوں کو جانے دیجئے ذرا ان نئی تراکیب پر ہی غور کرلیجئے تو اس زندہ رہنے کے عزم سے وجود میں آگئی ہیں۔

زیر استقبال' پس تولیہ' تہنیتی حوالہ' وسیلہ صفر' مقصود منزل' سرخ رنگ کی سبز قدم بس' ازمنہ ریڈلائن سے قبل کا دور' ہیئوں میں نہ شیوں میں یعنی نہ He اور نہ She' اکادمی بمعنی اک+ آدمی' ہمہ شما بمعنی رسالہ ہما اور رسالہ شمع پڑھنے والا عام اردو داں' عطیہ بالجبر یا بالبصر.......

یہ صرف چند تصرفات ہیں جو ان مضامین کے ذریعے ہماری زبان میں آئے ہیں۔ کچھ جان بوجھ کر کچھ اتفاقیہ۔ مگر ان سے یہ ضرور اندازہ ہوگا کہ یہ طنز و مزاح کے جزیرے مملکت ادب کی کس طرح توسیع کرتے ہیں۔

۱۹۴۵ء میں دوسری جنگ عظیم ختم ہوئی تھی۔ اس کی پچاس سالہ سالگرہ ان دنوں منائی جارہی ہے۔ اس جنگ عظیم میں برطانیہ نے بہت سختیاں جھیلی تھیں۔ آخر کار جب ہٹلر کو ناکامی ہوئی اور برطانیہ کے دونوں ایوانوں کا جلسہ ہوا تو چرچل نے کہا تھا:

"جنگ تو میں نے نہیں برطانیہ نے جیتی ہے۔ میں نے تو صرف اتنا کیا ہے کہ مایوسی کے کڑے سے کڑے لمحات میں بھی میں فتح کا نشان بلند کرتا رہا اور یہ کہتا رہا کہ فتح ہماری ہی ہوگی۔"

اردو والوں میں ماتمی آوازیں بہت بلند ہونے لگی ہیں۔ ضرورت اس کی ہے کہ چند استقامت پسند اس کی فتح مندی کی بشارت بھی دیں۔ اور اچھی طنزیہ اور مزاحیہ تخلیق سے زیادہ کسی زبان کی زندگی کا اور کوئی ثبوت نہیں ہوسکتا کہ مسکراہٹ زندگی کی دلیل ہے اور قہقہہ فتح مندی کا ثبوت۔ اگر ہنسنے کا عمل نصرت ظہیر سے اور کھیلنے کا عمل ان کے مخاطبین سے منسوب کردیا جائے تو اصغر گونڈوی کا یہ شعر حسب حال ہے۔ ان کے بھی اور ان کے قارئین کے لئے بھی۔

چلا جاتا ہوں ہنستا کھیلتا بحر حوادث سے
اگر آسانیاں ہوں زندگی دشوار ہوجائے

۸ مئی ۱۹۹۵ء

(پروفیسر) محمد حسن

ڈی-۷' ماڈل ٹاؤن
دہلی---۹

"اس لئے کہ تم میں تو مجاور بننے کی بھی صلاحیت نہیں ہے۔ لہٰذا تمہارا نام تہہ فہرست بھی نہیں آئے گا۔"

بہت دیر تک سر کھپانے کے باوجود ہم نہیں سمجھ پائے کہ یہ داد تھی یا بے داد۔

"خیر کوئی بات نہیں خاں صاحب۔" ہم نے کہا "لیکن اتنا تو ضرور مانیں گے کہ چاہے مجاوری ہو' یا صحافت یا شاعری' عزت تینوں میں ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ جن لوگوں کا تعلق مزارات کے انتظام و انصرام' صحیفہ نگاری' اور شعر گوئی سے رہا ہے انہیں ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا ہے اور بڑی حد تک آج بھی دیکھا جاتا ہے۔"

"ٹھہرو ٹھہرو! اتنا جوش میں نہ آؤ۔" انہوں نے ہمیں ٹوکتے ہوئے کہا۔ "تم انگریزوں کی طرح تاریخ سے جھوٹی گواہی دلوا رہے ہو۔ تاریخ میں اچھے مجاوروں' صحافیوں اور شاعروں کو کبھی قدر کی نگاہ سے نہیں دیکھا گیا۔ یہاں تک کہ ان لوگوں نے خود بھی اپنے اوپر قدر کی نگاہ نہیں ڈالی۔ غالب کو ہی لے لو۔ انہیں شاعری سے زیادہ سپہ گری پر ناز تھا۔ حالانکہ حشمت خاں کو تو ال تک سے نپٹنے کی ہمت نہیں تھی موصوف میں۔"

"اوفوہ' خاں صاحب آپ تو بال کی کھال نکالنے لگتے ہیں۔"

"مگر تم بھی تو بال ٹھاکرے کی طرح تاریخ کو مسخ کر رہے ہو جو نگہبانوں کو حملہ آور اور حملہ آوروں کو نگہبان قرار دیتا ہے۔"

"آپ سے کون جیت سکتا ہے خاں صاحب۔" ہم نے ہتھیار ڈال دیئے۔ "مانا کہ تاریخ میں مجاوری' صحافت اور شاعری کی کوئی عزت نہیں تھی۔ لیکن یہ تو مان لیجئے کہ فی زمانہ ان پیشوں کی بڑی وقعت ہے۔"

"کیسے مان لوں؟ انگریز کے دور میں ان پیشوں کی کچھ عزت رہی ہو تو رہی ہو' آج کل ان کی کم از کم میری نظر میں تو کوئی حیثیت اور عزت نہیں ہے۔ مجاوری کا وقار تب سے ختم ہوا جب سے ہر شہر میں نوگزے مزار برآمد ہونے لگے ہیں۔ صحافت کا معیار تب سے جاتا رہا جب سے تم نے تحت اللفظ لکھنا شروع کیا ہے۔ اور شاعری کی آبرو تب سے رخصت ہوئی جب سے....."

"جب سے؟" ہم دم بخود ہو کر ان کے جملے کی تکمیل کا انتظار کرنے لگے۔

"جب سے بشیر بدر نے مشاعرے پڑھنے شروع کئے ہیں۔ اور وہ بھی ترنم سے!" انہوں نے کہا اور ہم نے اطمینان کا سانس لیا۔

"خیر ایک بات بتایئے خاں صاحب۔" ہم نے میاں عبدالقدوس سے پوچھا۔ "آپ کو شاعری' مشاعرہ اور ترنم میں سب سے زیادہ کیا پسند ہے۔"

"مجھے شاعری سے زیادہ مشاعرہ اور مشاعرے سے زیادہ ترنم ناپسند ہے۔" انہوں نے کہا۔

"ناپسند؟ لیکن میں نے تو آپ کی پسند پوچھی تھی۔"

"بس تو اسی کو میری پسند سمجھو۔" انہوں نے پان کی ڈبیہ سے ایک جوڑا نکال کر منھ میں رکھتے ہوئے کہا۔

"گول مول بات مت کیجئے خاں صاحب۔ صاف صاف بتائیے۔ آپ کو ان تینوں میں سے کیا پسند نہیں ہے۔"

"مجھے آج کل ان میں سے تینوں ناپسند ہیں۔ شاعری مجھے اس لئے پسند نہیں کہ لوگ ہر سمجھ میں آنے والی شاعری کو اچھی شاعری کا اور نہ سمجھ میں آنے والی شاعری کو کلاسک کا درجہ دے دیتے ہیں۔ اور مشاعرے مجھے اس لئے ناپسند ہیں کہ ان میں شاعری کم اور مشاعری زیادہ ہوتی ہے!"

"مشاعری؟ یہ کیا بلا ہے۔"

"یہی تو وہ بلا ہے میرے عزیز جو اردو شاعری کی شعریت کو گھن کی طرح کھائے جارہی ہے۔ میر غالب انیس اور اقبال نے جو کی تھی وہ شاعری تھی اور ڈاکٹر نامنظور پی ایچ ڈی سے لے ڈاکٹر ساغر آر ایم پی تک درجنوں مشاعرے باز جو کچھ کررہے ہیں وہ مشاعری ہے۔"

"اور ترنم؟ اسے تو آپ نے چھوڑ ہی دیا۔" ہم نے یاد دلایا۔

"آہ! اس کا تم ذکر نہ ہی کرو تو بہتر ہے۔" وہ ایک لمبی اور سرد آہ بھر کر بولے۔

"ارے! خیر تو ہے۔ اتنی گہری آہ کیوں؟" ہم نے کہا۔

"کیا بتاؤں عزیزم!" وہ اظہار غم کے لئے مزید دو چٹکی زردہ منھ میں رکھتے ہوئے بولے۔ "آج کل مشاعروں میں ترنم کے نام پر جو کچھ گایا جارہا ہے اسے سن کر کلیجہ منھ کو آتا ہے۔ لمبے لمبے سانس بہ آواز بلند کھینچنے کو ناظمین مشاعرہ ترنم کہتے ہیں، چیخ نما تانوں کو گلے کا نور بتایا جاتا ہے، جو بھی بھیپھڑوں کی طاقت کا زیادہ سے زیادہ مظاہرہ کرسکے اور سننے والے کے کانوں میں گہرے سے گہرا شگاف ڈال سکے اسے ہمارے ادب شناس سب سے بڑا مترنم شاعر قرار دیتے ہیں۔ کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ جگر اور مجاز کی روحیں نہ جانے کیا سوچتی ہوں گی، مجروح سلطانپوری، خمار بارہ بنکوی، کیف بھوپالی اور شمیم جے پوری کے دلوں پر نہ جانے کیا گذرتی ہوگی۔ میں تو دن رات یہ دعاء کرتا ہوں کہ یا اللہ بعد از مرگ ان ترنم بازوں کی مغفرت کرنا اور ہمیں تا قیامت وسیم بریلویوں اور ساغر اعظمیوں کے بھیپھڑوں سے محفوظ رکھنا، آمین۔ ثم آمین!"

۔ کیف صاحب ان دنوں حیات تھے

"خدا کی پناہ' آپ تو معلوم ہوتا ہے ترنم والوں سے بری طرح خار کھائے بیٹھے ہیں۔ لیکن یہ تو آپ کو ماننا پڑے گا کہ عوام انہیں بے حد پسند کرتے ہیں اور ان ہی گلے باز شاعروں کی بدولت آج بھی مشاعروں میں زبردست بھیڑ اکٹھی ہو جاتی ہے۔!"

"بھیڑ کا کیا ہے! وہ تو ہمارے شہر کے چمڑو قوال کے پروگرام میں بھی اکٹھی ہو جاتی ہے۔" انہوں نے کہا۔

"پھر بھی' مشاعروں میں لوگ ترنم والوں کی وجہ سے ہی آتے ہیں۔" ہم نے کہا۔

"غلط! بالکل غلط۔ اگر مشاعرہ اس اعلان کے ساتھ کرایا جائے کہ اس میں ملک کے تمام بڑے بڑے ترنم باز شاعروں کو ہاتھ پیر باندھ کر اور منھ پر ٹیپ لگا کر اسٹیج پر بیٹھا دیا جائے گا تو میرا دعویٰ ہے اور بھی زیادہ لوگ مشاعرہ سننے آجائیں گے۔"

شاعروں مشاعروں اور مجاوروں کا ذکر چل رہا ہے تو اب کچھ باتیں مشاعروں کے بارے میں بھی ہو جائیں جنہیں عرف عام میں خواتین کے مشاعرے اور میاں عبدالقدوس کی زبان میں زنانہ مشاعرے کہتے ہیں۔

زنانہ مشاعرے' جیسا کہ نام سے بھی ظاہر ہے ان مشاعروں کو کہتے ہیں جن میں زنانہ شاعرات حصہ لیتی ہیں۔ آپ کہیں گے' از روئے گرامر زنانہ شاعرات کی ترکیب غلط ہے' کیونکہ شاعرات تو زنانہ ہوتی ہی ہیں اس لئے انہیں مزید زنانہ کہنے کی ضرورت نہیں۔

بات آپ کی ٹھیک ہے۔ لیکن کیا کیجئے صاحب! ایک مرتبہ ہم نے میاں عبدالقدوس سے پوچھا تھا کہ قبلہ' عورتوں کے مشاعرے اور عام مشاعرے میں بنیادی فرق کیا ہوتا ہے' تو انہوں نے بھی کچھ ایسا ہی جواب دیا تھا۔

کہنے لگے۔ "زنانہ مشاعرے میں صرف خواتین شعر پڑھتی ہیں' جبکہ عام مشاعرے میں نازک اندام کلین شیو خواتین کلام سناتی ہیں۔"

ہم نے کہا۔ "اگر کلین شیو خواتین کی تشریح فرمادیں تو بڑی عنایت ہوگی!"

"اس میں تشریح کی کیا ضرورت ہے؟" وہ کہنے لگے۔ "خواتین دو طرح کی ہوتی ہیں اور دوسری طرح کی خواتین کو کلین شیو خواتین کہتے ہیں۔"

"جان کی امان پاؤں تو کچھ عرض کروں۔" ہم نے التجا کی۔

"کہو!" وہ حقہ گڑگڑاتے ہوئے بولے۔

"آپ کی بات اب بھی سمجھ میں نہیں آئی۔ اگر اس تشریح کی تشریح فرمادیں تو عنایت ہو۔"

"لاحول ولاقوت۔ کبھی کبھی تو نا سمجھی کے معاملے تم اردو صحافیوں سے بھی آگے نکل جاتے ہو۔ برخوردار میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ یہ جو پتلی کمر لمبے بال اور پان سے سرخ لبوں والے کلین شیو شاعر تمہیں مردانہ مشاعروں کے اسٹیج پر نظر آتے ہیں، جو کولہے پر ہاتھ رکھ کر زنانہ ترنم میں لہک لہک کر زنانہ موضوعات والے شعر اور گیت گاتے ہیں اور مجرے والیوں کے انداز میں نزاکت سے ہاتھ اٹھا کر داد وصول کرتے ہوئے زنانہ لہجے میں آداب عرض کہتے ہیں۔ انہیں تم کلین شیو خواتین نہیں تو اور کیا کہو گے؟"

پچھلے دنوں ہم زندگی میں پہلی مرتبہ خواتین کا ایک مشاعرہ دیکھنے گئے تو ذہن میں یہ تصور تھا کہ بہت سے سیاہ سفید اور رنگین برقعے اسٹیج پر بیٹھے کانا پھوسی کر رہے ہوں گے اور مائک کے قریب مرغیوں کو بند کرنے والی الٹی ٹوکری جیسے کسی سفید لٹھے کے برقعے سے مرغیوں کی آواز کے بجائے غزل یا رباعی بر آمد ہو رہی ہوگی۔

لیکن مشاعرہ گاہ میں پہنچ کر اسٹیج پر نظر پڑی تو آنکھیں چندھیا گئیں اور ہم یہ سوچتے ہوئے واپس چل پڑے کہ غلطی سے کسی زنانہ فیشن شو میں آگئے ہیں۔ مگر وہاں ہر طرف خواتین کے مشاعرے کے بینر لگے ہوئے تھے۔ بلکہ ایک بڑے بینر پر تو یہ بھی لکھا تھا کہ "خواتین کا مشاعرہ یہی ہے۔" اس عبارت کے اوپر "فانوس بن کے جس کی حفاظت" والا شعر بھی تحریر تھا۔ چنانچہ ہمیں ماننا پڑا کہ یہ نہ تو فیشن شو ہے، نہ فلمی اداکاراؤں کی کانفرنس ہے، نہ رقاصاؤں کی تقریب ہے، بلکہ اردو کی خواتین شاعرات کا مشاعرہ ہے۔

اس کے بعد مشاعرہ ہوا۔ اور خوب زور دار طریقے سے ہوا۔ مگر ہم اس کا زیادہ لطف نہ لے سکے۔ میاں عبدالقدوس کے فکر انگیز تبصروں سے کچھ دھیان بٹتا تو مشاعرے سے کچھ لطف اندوز بھی ہوتے۔ انہوں نے ایسے ایسے تبصرے کئے کہ ہمارا دماغ اور ایک طرف کا کان دونوں جھنجھنا اٹھے۔

بلکہ سچ پوچھئے تو وہ مشاعرہ شروع ہونے سے پہلے ہی شروع ہوگئے۔ اسٹیج پر بیٹھی ہوئی شاعرات پر ایک سرسری نگاہ ڈالتے ہی بولے۔

"واہ یہاں تو شاعری کی تمام اصناف موجود ہیں۔"

"اصناف؟ کیا مطلب؟" ظاہر ہے ہم نے پوچھا کہ ان کے واحد سامع ہم ہی تھے۔

"مطلب یہ کہ یہاں تو غزلیں بھی موجود ہیں اور رباعیاں بھی جلوہ ساماں ہیں۔"

"آپ کا اشارہ غالباً ان خوش پوش اور خوش شکل شاعرات کی جانب ہے جو اسٹیج کے دونوں جانب تشریف رکھتی ہیں۔" ہم نے ایک کرسی میں دھنستے ہوئے کہا۔

"ہاں بھئی! ذرا دیکھو تو سہی۔ سبحان اللہ۔ قدرت نے بھی کیا کیا حسین شعر نکالے ہیں اس زمین میں۔ خاص طور سے اس چھوٹی بحر کی غزل پر غور کرو۔" ان کا اشارہ ایک دبلی پتلی خاتون کی طرف تھا۔

"خدا خیر کرے۔ آج تو آپ بڑے رومانٹک موڈ میں دکھائی دیتے ہیں۔"

".....اور اس نظم معریٰ کا بھی کوئی جواب نہیں جو گوشہ بحر طویل میں ہے۔" انہوں نے سنی ان سنی کرتے ہوئے کہا۔

اس مرتبہ ان کا اشارہ کس طرف تھا یہ سمجھنے کے لئے ہم نے ان کی انگلی کی سیدھ میں اپنی ناک گھما کر دیکھا۔ ہمیں لباس اور وضع قطع سے آزاد خیال دکھائی دینے والی ایک شاعرہ نظر آئیں جو کئی بھاری بھرکم شاعرات کے پہلو میں اسٹیج پر بیٹھی تھیں۔

"خدا کی پناہ کیا دعوت سخن دیتا ہوا انداز ہے۔ واہ واہ! کیا بات ہے۔ کیا بات ہے، مکرر ارشاد!"

"الٰہی خیر! کیا ہو گیا ہے خاں صاحب آپ کو؟" ہم نے انہیں ٹوکا کہ اگلی سیٹوں کے کئی لوگ مڑ کر دیکھنے لگے تھے "اس طرح داد دیں گے تو فساد ہو جائے گا۔"

مگر وہ اس وارننگ کے باوجود جاری رہے۔ "ارے ادھر دیکھو۔ غزل کے ساتھ قطعہ بھی ہے۔"

یہ اشارہ انہوں نے ایک ایسی شاعرہ کی طرف کیا تھا جو گود میں ایک بچہ بھی لئے ہوئے تھیں۔ ہمیں ہنسی آ گئی۔ پھر یوں ہی ذرا ان کے تبصروں سے لطف اندوز ہونے کے لئے پوچھا۔

"اور وہ جو بزرگ خاتون بیٹھی ہیں، بالکل بیچ میں۔ ان کے بارے میں کیا ارشاد ہے؟" ہمارا اشارہ مشاعرے کی ستر سالہ صدر صاحبہ کی طرف تھا۔ جن کے چہرے پر ایک اداس سی سنجیدگی چھائی ہوئی تھی۔ میاں عبدالقدوس نے چند لمحے آنکھیں جھپکا کر انکی جانب دیکھا، پھر بے زاری کا اظہار کرتے ہوئے بولے۔ "چھوڑو یار اتنی اچھی اچھی باتیں ہو رہی ہیں اور تم یہ مرثیہ بیچ میں لا رہے ہو۔"

کچھ دیر بعد ایک طویل قامت شاعرہ کلام سنانے کے لئے مائک پر آئیں تو کہنے لگے۔

"اسے کہتے ہیں آزاد نظم۔"

"مگر آزاد نظم میں مصرعے چھوٹے بڑے ہوتے ہیں جناب، جبکہ یہ محترمہ دارز قد ہونے کے باوجود تن و توش سے ماشاء اللہ متناسب معلوم ہوتی ہیں۔" ہم نے کہا۔

"چلو کوئی بات نہیں۔ آزاد نظم نہیں تو فراق گورکھپوری کی غزل کہہ لو۔"

غرض اسی طرح کی باتوں میں مشاعرہ ختم ہو گیا۔ مشاعرہ گاہ سے واپسی پر اردو ادب میں شاعرات

کے حصے اور اردو کی بہترین شاعرات کے بارے میں بحث چھڑی گئی۔ دوران بحث ہم نے میاں عبدالقدوس سے پوچھا۔

"اچھی شاعرہ بننے کے لئے ایک خاتون کو کیا کرنا چاہئے؟"

"اچھی شاعری!" انہوں نے نہائت سنجیدگی سے کہا۔

"مذاق میں مت ٹالئے خاں صاحب سنجیدگی سے بتایئے۔ کامیاب شاعرہ بننے کے لئے کن کن چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے۔"

چند لمحے غور کرنے کے بعد بولے۔ "اچھی شاعرہ کا جواب دے چکا ہوں' کامیاب شاعرہ بننے کے لئے صرف دو چیزیں درکار ہیں۔ اچھی صورت اور میک اپ کا ڈھیروں سامان!"

☆ ☆ ☆

THIS EBOOK IS DOWNLOADED FROM
SHAAHISHAYARI.COM

LARGEST COLLECTION OF URDU
SHERS, GHAZALS, NAZMS AND EBOOKS.

زبان یار من...؟

اردو کی سو سال پرانی مشہور لغت "فرہنگ آصفیہ" کے مولف، خاں صاحب مولوی سید احمد دہلوی نے فرہنگ کے دیباچے میں دہلی کی زبان کی تعریف میں ایک قطعہ نقل کیا ہے۔ جس کے چند اشعار یہ ہیں۔

کیا فصاحت کا کہوں حال کسی سے نہ سنی
عرش سے فرش تلک مثل زبان دہلی
ہیں نئے ڈھنگ نئے رنگ نئی گفت و شنید
ایک عالم سے نرالا ہے جہان دہلی
میرے نزدیک تو جب داد فصاحت کی ملے
دین اللہ کا ہو اور زبان دہلی
ہوسکے اس کا فصیحان جہاں سے نہ جواب
گویا قرآن زباں ہے یہ زبان دہلی
ادب آموز ملائک ہیں یہاں کے جاہل
رشک حوران بہشتی ہیں بتان دہلی
کیوں نہ مطبوع جہاں یاں کی زباں ہو محسن
سب زبانوں کا خلاصہ ہے زبان دہلی

دیباچے میں اور دیگر مقامات پر بھی سید صاحب نے دہلی کی زبان کا بڑی محبت اور عقیدت کے

ساتھ ذکر کیا ہے۔ جا بجا اس کے قصیدے پڑھے ہیں اور اسے دنیا کی تمام زبانوں میں افضل و برتر قرار دیا ہے۔ اگر آپ ڈھائی ہزار سے زائد صفحات پر مشتمل اس فرہنگ کا مطالعہ کریں (جی ہاں مطالعہ، کیونکہ یہ غالباً اردو کی واحد فرہنگ ہے جو اس درجہ معلوماتی اور دلچسپ ہے کہ ادبی محفلوں میں اکثر ہونے والے لسانی فسادات کے وقت حوالہ کے لئے ورق گردانی کی ہی نہیں بلکہ ناول کی طرح پڑھی جانے کی بھی چیز ہے۔) تو آپ پائیں گے کہ یہ سیکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں ایسے گفتنی و ناگفتنی الفاظ سے بھری ہے جو کبھی صرف اور صرف دہلی میں بولے اور سمجھے جاتے تھے۔

دہلی سے سید صاحب کے عشق کا یہ عالم تھا کہ انہوں نے فرہنگ کے ابتدائی حصہ میں مختلف مضامین کے تحت نہ صرف دہلی والوں کی پوشاک، رہن سہن پکوانوں اور رسوم و راوج کا ذکر کیا ہے بلکہ ایک علاحدہ مضمون دہلی کے سوداگروں کی آوازوں اور فقیروں کی صداؤں پر بھی لکھ دیا ہے جس کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہیں۔ اس مضمون کو پڑھتے جایئے، پرانی دہلی یعنی شاہ جہان آباد کا نقشہ آپ ہی آپ نگاہوں کے سامنے پھرنے لگے گا۔

کوئی "نون کے بتاسے کالی بھونرالی نمکین" کی آواز لگا کر ہانڈی میں نمک ڈال کر گھلائی ہوئی، کالے بھنورے جیسی جامنیں بیچتا نظر آئے گا۔ کہیں "گرمی کی ٹھنڈائی ہے، میرٹھ سے منگائی ہے" کی صدا کے ساتھ کیرو بکتے ہوئے ملیں گے جو میرٹھ کے نزدیک کھیڑ میں بکثرت پیدا ہوتے تھے۔ کسی خوانچہ پر شہتوت فروخت ہو رہے ہوں گے اور خوانچہ والا آواز لگا رہا ہوگا "قدرت کی بنی ہیں جلیبیاں کھالو، کاٹھ کی لکڑی کا بنا ہے جلیبا لے لو۔"

کچھ قدم آگے بڑھ جایئے تو سہ پہر سے ہی چاندنی چوک میں، جامع مسجد کے آگے، چاوڑی بازار میں، فراش خانہ کے باہر، بھری مشک کندھے پر لئے، مشک پر تر بتر کپڑا ڈالے، ایک ہاتھ میں ٹھنڈے اور میٹھے پانی سے بھرا کٹورا لئے اور دوسرے ہاتھ سے دو کٹورے بڑے مزے سے تال سر کے ساتھ ملا کر بجاتے ہوئے سقے دکھائی دیں گے۔ کوئی کہتا ہے۔ "سبیل ہے پیاسوں کو۔" کوئی کہتا ہے۔ "تیرے پاس ہو تو دے جا، نہیں پی جا راہ مولا۔"

اور کوئی رسولؐ کے نواسوں کو یاد کر رہا ہے۔

پانی پیو تو یاد کرو پیاس امام کی
پیاسو! سبیل ہے یہ شہدوں کے نام کی

اور آگے چلئے تو بلیماران، مٹیا محل، چتلی قبر اور تراہا بہرام خاں کی گلیوں میں فقیروں کی صدائیں کانوں میں پڑیں گی۔

"کیا تھا کیا ہو گیا۔ چمن تھا گل ہو گیا۔ گل تھا چمن ہو گیا۔"

"یا درب کی اور خیر سب کی۔"

"یا فرید شکر گنج۔ نہ رہے دکھ نہ رہے رنج۔"

"تیرے آگے کی بھی خیر۔ تیرے پیچھے کی بھی خیر۔"

اور آپ ان صداؤں کے پر پیچ معانی کی بھول بھلیاں میں کھو کر رہ جائیں گے۔ یہ سب لکھتے ہوئے' سید صاحب نے جو کہ جامع مسجد کے موجودہ شاہی امام سید عبداللہ بخاری کے پردادا کے خسر تھے' دہلی کی مٹتی ہوئی قدروں کا مرثیہ بھی پڑھا ہے اور زبان کے بگڑنے کا رونا بھی رویا ہے۔ ان کے مضامین پڑھنے کے بعد رہ رہ کر خیال آتا ہے' اگر آج سید صاحب زندہ ہوتے اور اپنے پیارے شاہجہان آباد کی سیر کرتے تو نہ جانے ان کے دل کا کیا حال ہوتا۔

وہ سڑکیں جن پر طرح طرح کی میٹھی بولیاں اور کٹوروں کی چھن چھن سنائی دیتی تھی' آج اسکوٹروں کی ٹرٹر اور موٹر سائیکلوں کی پھٹ پھٹ سے لرزتی رہتی ہیں۔

جو گلیاں کبھی حیات و موت کا فلسفہ سمجھانے والی پر معنی فقیرانہ صداؤں سے گونجتی تھیں' اب وہ غلام فرید صابری کی بھونڈی' عزیز احمد قوال کی مضحکہ خیز اور کمار شانو کی بے ہودہ آوازوں کے شور سے بھری رہتی ہیں۔

رہی زبان تو وہ اب اندرون شاہجہاں آباد کے قدیم گھرانوں تک سمٹ کر رہ گئی ہے۔ باقی تین چوتھائی دہلی پر پنجاب' ہریانہ' بہار اور یوپی کی نہ جانے کیسی کیسی بولیوں کا راج ہے۔

آپ بس اسٹاپ پر بس کے انتظار میں کھڑے ہیں۔

اور جس طرف سے بس آئے گی' اس طرف کم' بغل میں کھڑی ہوئی حسینہ کی طرف زیادہ دھیان سے دیکھ رہے ہیں۔

اس کے سلیقے سے ترشے ہوئے بال' ستواں ناک' گول ٹھوڑی' بھرے بھرے ہونٹ' ابھرے سینے' پتلی کمر' خوبصورت پیر اور نہایت عمدہ تراش خراش کے ساتھ سلے ہوئے خوش رنگ لباس کو دیکھ دیکھ کر دل ہی دل میں قدرت کی صناعی' حسینہ کی خوش ذوقی اور درزی کے فن کی داد دے رہے ہیں' عش عش کر رہے ہیں۔

سوچ رہے ہیں جب صورت اتنی اچھی ہے تو اس کی زبان کتنی شیریں ہوگی۔ تصور کی آنکھ سے دیکھ رہے ہیں کہ وہ میر کی غزل آپ کے قریب آگئی ہے اور نقرئی گھنٹیوں جیسی کھنکتی آواز میں کہہ رہی ہے۔ "اگر میرا خیال غلط نہیں تو میں نے پہلے بھی آپ کو کہیں دیکھا ہے۔"

تخیل کے کان سے یہ جملہ سنتے ہی آپ کا ذہن قطب مینار کی آخری منزل پر اڑنے لگتا ہے اور آپ کا جی چاہتا ہے کہ... کہ...

سرکاری کاغذوں کے مطابق ۹ مارچ ۱۹۵۱ء کو ضلع بلند شہر (اترپردیش) کی تحصیل سکندر آباد کے محلہ بھاٹیہ واڑہ میں ایک غریب خاندان میں پیدا ہوا' پیدائش کے بعد مغربی اترپردیش کے شہر سہارنپور میں آنکھ کھولی' مگر احتیاطاً" ہوش نہ سنبھالا کہ والد صاحبؒ کافی غصہ والے آدمی تھے۔

پھر محمد علی جوہر لائبریری' مسجد خانی باغ نخاسہ' میونسپل اسکول محلہ انصاریان و محلہ شاہ بہول اور مدرسہ مخزن العلوم کے لائق ترین مولوی صاحبان اور اساتذۂ کرام کی قمچیوں کے سائے میں الف بے تے پڑھی' مگر عقل نہ آئی۔

چنانچہ بالغ ہونے کے لیے اسلامیہ انٹر کالج سے رجوع کیا' جہاں نورانی صوت اور روشن دماغ استادوں نے نہ جانے کیسی تعلیم دی کہ جیسے ہی ہوش و عقل نے آنکھیں کھولیں نکسل باڑی تحریک سے جنم لینے والی باغی انقلابی پارٹی سی پی آئی (ایم ایل) کو باقاعدہ گلے لگا کر مارکس' اینجلس' لینن اور ماؤزے تنگ کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کرلیا جو آج تک نہیں کھلا ہے۔

اس کے بعد شاعری کی' خواب دیکھے' دہرہ دون کے تاریک جنگلوں میں سرخ انقلاب کو آواز دی' کوئی جواب نہ ملنے پر دوبارہ بستیوں کا رخ کیا' سی پی آئی (ایم ایل) کو چھوڑ کر سی پی آئی کو اپنایا' ایمرجنسی میں جیل یاترا کی' جنتا پارٹی کی حکومت میں جیل اور مقدمے جھیلے اور نہ جانے کیا کیا ہوا' مگر انقلاب نہ آیا!

اس دوران کسی طرح ہاتھ پیر مار کر گریجویشن کیا' میکینکل کاموں اور الیکٹرانکس کا شوق ہوا تو آئی ٹی آئی اور ریڈیو انسٹی ٹیوٹ میں باقاعدہ اور بے قاعدہ دونوں طرح کی تربیت حاصل کرکے شوق کو

۔ محترم عبدالعزیز قادری' جو چشتیہ' سہروردیہ اور نقشبندیہ سلسلوں سے بھی تعلق رکھتے ہیں اور قادرالکلام شاعر ہیں۔

مگر تبھی وہ حسینہ چونک کر آپ سے پوچھتی ہے۔

"پراجی، ہنتر تہاڈی گڑھی وچ کی بجا ہے؟" (بھائی صاحب، اب آپ کی گھڑی میں کیا بجا ہے؟)

اس کا کرخت لہجہ سنتے ہی آپ دھڑام سے نیچے آجاتے ہیں اور گھڑی دیکھ کر وقت بتانے کے بعد آپ کو محسوس ہوتا ہے کہ اس کے بال کچھ زیادہ ہی ترشے ہوئے ہیں، ناک آگے سے خم کھائی ہوئی ہے، ٹھوری پوری طرح گول نہیں، ہونٹ بہت موٹے ہیں، سرخ کرتا ضرورت سے زیادہ لمبا سلا ہوا ہے، اور اس پر نیلی شلوار قطعی میچ نہیں کر رہی ہے۔ یوں آپ کا تمام جمالیاتی ذوق بھک سے اڑ جاتا ہے۔

پھر جب بس آتی ہے اور مسافروں کے کندھوں پر سوار ہو کر آپ بس کے اندر پہنچتے ہیں تو کنڈکٹر آپ کا راستہ روک کر کھڑا ہو جاتا ہے۔

"رے ٹکس تو لے لے بھائی صاب!" وہ کہتا۔ اور یہ لہجہ اور زبان سنتے ہی آپ کا خون کھول اٹھتا ہے۔

"کیا آپ تمیز سے بات نہیں کر سکتے۔" آپ کہتے ہیں۔

"تمیج؟ ہور کیسی ہوتی ہے تمیج بھائی صاب۔ منے تیرے سے کون سی گلط بات کہہ دی بھائی!"

"یہ تو تڑاک کیوں کر رہے ہیں۔ تمیز سے کیوں نہیں بولتے؟"

"حد ہو گئی بھائی! تو تو کچھ ڈھیر ہی پڑھیا لکھیا بن رہیا سے۔ منے تجھے بھائی صاب کہیا تو تھا۔ اب بول۔ ہور کے کہوں تنے مہاراج جی؟"

آپ کچھ جواب دیئے بغیر جل بھن کر دو روپے کی بجائے تین روپے کا ٹکٹ لے لیتے ہیں اور آگے بڑھ جاتے ہیں۔

"دفتر کے سامنے بس سے اترنے کے بعد آپ پنواڑی کی دکان پر رکتے ہیں۔ سگرٹ اور پان لینے کے بعد حساب کر کے چلنے لگتے ہیں کہ پنواڑی کی آواز آپ کو روک لیتی ہے۔

"بابو جی۔ سائد بھول گئے۔ ایک روپے کل کے باقی ہیں اور ساڑھے تین روپیہ پرسوں کا ہے جب آپ نے دو پان لیا تھا!"

"جی نہیں!" آپ کو پھر غصہ آجاتا ہے۔ "ایک روپیہ کل کا ہے اور ساڑھے تین پرسوں کے جب دو پان لئے تھے۔ لاحول ولا قوت، یہ لیجئے ساڑھے چار روپے!" آپ بھنا کر رقم ہاتھ پر رکھ دیتے ہیں اور پنواڑی حیرت سے آنکھیں جھپکتے ہوئے آپ کو دیکھتا رہ جاتا ہے۔

دفتر میں داخل ہوتے ہی ری سپشنٹ روک لیتی ہے۔

"صاحب آپ کو کئی بار مالوم کر چکا ہے مین! لگتا ہے کوئی لفڑا ہے۔"

لڑکی کی زبان پر لاحول پڑھتے ہوئے آپ صاحب کے کمرے میں داخل ہوتے ہیں۔ آپ کو دیکھتے

ہی صاحب اپنا پائپ ایش ٹرے پر رکھ دیتا ہے اور آپ کو بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے۔

"ہاؤ....."

"جی؟" آپ سہم جاتے ہیں۔

"ہاؤ مینی ٹائم آئی ٹولڈ یو کہ بھئی وقت پر دفتر آیا کرو۔ بٹ تم سنتے ہی نہیں ہو۔ ٹوڈے یو آر تین گھنٹے لیٹ۔ کل یوور ڈھائی گھنٹہ لیٹ پرسوں یو کیم دو گھنٹے۔ آئی سے وہاٹ اٹ از گوئنگ آن ان دس دفتر؟ آئی تھنک کل کو یوول کم چار گھنٹہ لیٹ؟"

"نو سر!"

"وہاٹ نو سر!؟ نو سر کہن نال کی ہوندا اے۔ لاسٹ ہفتہ آئی وارنڈ یو کہ اف لیکسٹ ٹائم تم لیٹ آتے ہو تو وی شیل ٹیک ایکشن اگینسٹ یو۔ اور تمہاڈی چارج شیٹ بھردتی جائے گی۔ بٹ۔ اب بیٹھے بیٹھے میرا منہ کیا دیکھ رہے ہو۔ اے کی ہے؟! سپلی کیشن؟"

"نہیں جناب۔ یہ میرا استعفا ہے۔ میں دہلی والا ہوں اور صرف دہلی کی زبان جانتا ہوں۔ خدا حافظ....."

☆ ☆ ☆

مشورت

بعض لوگوں کو مشورہ دینے کا مرض کی حد تک شوق ہوتا ہے۔ جہاں کوئی مسئلہ سامنے آیا جھٹ اپنا مشورہ لے کر کود پڑتے ہیں۔ لڑکے لڑکیوں کے رشتے اور شادی بیاہ ایسے معاملے ہیں جن میں لوگ سب سے زیادہ مشورے بازی کرتے ہیں۔ ان معاملوں میں ہر شخص خود کو رائے اور مشورہ دینے کا اہل سمجھتا ہے۔ چنانچہ آپ مانگیں یا نہ مانگیں 'لوگ ہر وقت مشورہ دینے کو تیار ملیں گے۔

مثال کے طور پر صدیق بھائی اپنی بیٹی رقیہ کا رشتہ دلدار حسین کے بیٹے شرف الدین عرف شرفو سے طے کرنے جا رہے ہیں تو یہ دوڑے دوڑے صدیق بھائی کے پاس پہنچیں گے اور پوچھیں گے---

"میاں سنا ہے آپ نے بیٹی رقیہ کا رشتہ دلدار حسین کے لونڈے سے طے کر دیا ہے۔"

"جی ابھی پوری طرح طے نہیں ہوا ہے' لیکن آپ طے ہی سمجھئے۔ اللہ نے چاہا تو اگلے ہفتے سگائی چڑھ جائے گی۔"

"اگلے ہفتے؟ مگر میاں شیطانوں نے کہا ہے جلدی کا کام سیانے کا۔ میرا مطلب ہے سیانوں نے کہا ہے کہ جلدی کا کام شیطان کا۔ آپ نے دلدار حسین کے لونڈے کے بارے میں پوچھ تاچھ تو پوری کر لی ہے نا؟ میں نے سنا ہے لونڈا آٹھویں فیل ہے۔"

"اجی فیل ہے تو کیا ہوا۔ آج کل پڑھائی لکھائی کو پوچھتا ہی کون ہے؟ بڑے بڑے ڈگریوں والے جوتے چٹخاتے پھرتے ہیں اور شرفو تو ماشاء اللہ سائیکل مستری ہے۔ ہر مہینے بارہ پندرہ سو مزے میں کما لیتا ہے۔ پھر اپنی لڑکی ہی کون سی ایسی پڑھی لکھی ہے؟"

"میاں خود اپنی لڑکی کے بارے میں تو ایسا نہ کہو۔ ماشاء اللہ کلام مجید پورا کر چکی ہے۔ اور کیا

چاہیے!؟ لڑکیاں اتنا ہی پڑھ لیں تو بہت ہے۔ چلو خیر۔ اب تم نے فیصلہ کر ہی لیا ہے تو ٹھیک ہے۔ مگر دیکھو بھیا شادی بیاہ کا معاملہ ہے۔ ذرا دیکھ بھال کے چلنا۔ پاؤں دیکھ کر چادر پھیلانا اور زیادہ فضول خرچی نہ کرنا۔ میں تمہیں سگائی سے لے کر شادی تک سارے معاملوں کا ایسا حساب بنا کر دوں گا کہ اللہ رب العزت نے چاہا تو سب کام تھوڑے خرچ میں شاندار طریقے سے ہو جائے گا۔ اچھا اب سنو۔ پہلے تو یہ دیکھو کہ سگائی میں کیا دینا ہے؟...''

اور اس کے بعد وہ منگنی، جہیز، ٹینٹ ہاؤس کا خرچ، حلوائی کا خرچ، باراتیوں کا حساب، یہاں تک کہ لاؤڈ اسپیکر کہاں سے سستا ملے گا یہ بھی بتادیں گے اور اصرار کریں گے کہ ان کے مشورے پر حرف بہ حرف عمل ہونا چاہئے۔

تاہم ایسے مشورے عام طور پر بے ضرر ہوتے ہیں۔ پریشانی تب کھڑی ہوتی ہے جب آپ کوئی ایسا کام کر رہے ہوں جس کا خود آپ کو کوئی تجربہ نہ ہو۔ ایسے میں لوگ طرح طرح کے مشورے دے کر ناک میں دم کر دیتے ہیں۔

شرف الدین کو ہی لے لیجئے۔ ہوا یہ کہ شادی کے بعد میاں شرفو نئی نویلی دلہن کے عشق میں ایسے گرفتار ہوئے کہ سائیکلوں کی دکان ٹھپ ہو گئی اور سائیکل مرمت کے کام سے ان کا دل اچاٹ ہو گیا۔ دلہن نے رائے دی کہ دکان میں چائے کا ہوٹل کھول لو تو وارے نیارے ہو جائیں' یونکہ ہماری پھوپھی کے بھتیجے نے بھی جلد سازی چھوڑ کر چائے کی دکان کر لی تھی اور اب ماشاء اللہ سارا محلہ اس کا مقروض ہے۔ جب کہ پہلے وہ خود قرض میں ڈوبا رہتا تھا۔ قرض لینے کے لیے دلہن نے اپنے کنگن بھی خوشی خوشی بلکہ زبردستی دے دیئے۔ بیوی کے جذبہ ایثار نے میاں شرفو میں کچھ ایسی پھونک بھر دی کہ کنگن کے ساتھ سسرال سے ملی ہوئی اپنی انگوٹھی بھی ملادی اور تین چار ہزار روپے سے اچھا خاصا چائے خانہ بنالیا۔ سب کام ٹھیک چل رہا تھا۔ مگر آخر میں بھٹی نے سارا کام بگاڑ دیا۔ میاں شرفو کوئلے کی بھٹی دکان کے آگے دائیں طرف بنوا رہے تھے کہ ایک صاحب سے یہ پوچھنے کی غلطی کر بیٹھے 'کیوں چچا۔ بھٹی یہاں ٹھیک رہے گی نا!

اب چچا تو مشورہ دینے کے لیے تلے ہی بیٹھے تھے۔ فوراً ناک سکوڑ کر بولے--

''میاں ایسا غضب نہ کرنا۔ بھٹی دائیں طرف نہیں بائیں طرف لگاؤ۔ ادھر سے سرکاری نلکا پاس پڑے گا۔''

بات معقول تھی۔ سو شرفو میاں نے آدھی بنی بھٹی تڑوا کر بائیں جانب بنوانا شروع کر دی۔ لیکن ابھی چند اینٹیں ہی لگی تھیں کہ ایک اور چچا میاں آ نکلے۔ بولے ''ارے بھئی شرفو یہ کیا کر رہے ہو۔ بھٹی دکان کے آگے لگا رہے ہو؟ بھائی میرے یہ غیر قانونی ہے۔ میونسپلٹی والے آ کر گرا دیں گے۔''

"مگر چچا اور سب چائے والوں نے بھی تو اپنی بھٹیاں دکان کے آگے نالی کے اوپر بنا رکھی ہیں۔"

"بنائی ہیں تو کیا ہوا۔ انکرو ہمنٹ والے آج نہیں تو کل آجائیں گے۔ غیر قانونی کام کرنا قانون کی رو سے غیر قانونی ہے' اور پھر گرمی برسات میں بھی تو پریشانی ہوگی۔ اس پر ترپال لگانی پڑے گی۔ تب سارا دھواں اندر جائے گا۔ جس سے گاہکوں کو پریشانی ہوگی اور..."

اور شرفو میاں سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔ اتنے میں ایک اور صاحب نے مشورہ دیا۔

"ایسا کرو بھٹی دکان کے اندر دائیں کونے میں لگاؤ۔ وہاں سے گاہکوں پر بھی نظر رہے گی۔ رہی دھوئیں کی بات تو ایک چمنی لگا لینا۔"

شرفو میاں نے مزدور کو دائیں کونے میں بھٹی بنانے کے لیے کہہ دیا۔ مگر تبھی محلے کے ایک بزرگ ادھر آنکلے۔ بھٹی دیکھتے ہی بولے۔ "بھائی شرفو۔ اس کونے میں بھٹی لگاؤ گے تو دن بھر دھوپ کا سامنا کرنا پڑے گا۔ بائیں کونے میں بناؤ گے تو فائدے میں رہو گے اور پیٹھ بھی قبلہ کی طرف نہیں رہے گی۔"

شرفو میاں نے مزدور بائیں کونے میں لگا دیا تو ایک اور صاحب آدھمکے۔ پہلے تو شرفو میاں کا حال چال پوچھا۔ پھر مزدور کو بائیں کونے میں بھٹی بناتے دیکھ کر چونک پڑے اور بولے۔ "بھئی یہ کیا حماقت ہے؟ بھٹی تو دکان کے بیچوں بیچ ہونی چاہئے تاکہ گاہکوں کو تم تک پہنچنے میں آسانی رہے۔"

شرفو میاں کا سر گھوم گیا۔ اچانک انہوں نے مزدور کا حساب کیا۔ بغیر بھٹی کے ہوٹل کی اچھی طرح خود ہی صفائی کی اور اگلے روز وہاں پیچ کش' پلاس اور پنکچر لگانے کا سامان لے کر بیٹھ گئے۔

اس دن سے ہوٹل کے اندر سائیکل مرمت کی دکان ایسی چلی' ایسی چلی کہ ایک سال میں ہی رقیہ کے کنگن واپس آگئے۔

مگر ان سے بھی خطرناک مشورے وہ ہوتے ہیں جو بیماریوں میں دیئے جاتے ہیں۔ اول تو ہماری دعا ہے کہ کوئی بیمار نہ ہو' اور اگر ہو تو خدا اسے مزاج پرسی کرنے اور مشورے دینے والوں سے بچائے۔ آدمی بیماری سے لڑ سکتا ہے۔ لیکن عیادت کے لئے آکر طرح طرح کے مشورے دینے والوں سے بچنا کسی کے بس میں نہیں ہے۔ ہمارے عزیز دوست اور قریبی مشیر میاں عبدالقدوس کے بقول ہندستان میں مریضوں کا مورٹیلٹی ریٹ (شرح اموات) زیادہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ آدھے مریض تو بیماری سے مرتے ہیں' آدھے ڈاکٹر کا بل دیکھ کر دم توڑ دیتے ہیں اور باقی آدھے عیادت کرنے والوں کے شکار ہو جاتے ہیں۔

ہم نے ان سے بہتیرا کہا کہ خاں صاحب جب آدھے مریض بیماری سے اور آدھے ڈاکٹر کا بل دیکھ کر فوت ہو گئے تو یہ عیادت کا شکار ہونے والے مزید آدھے مریض کہاں سے آ گئے؟ ایک تعداد کو تین آدھے حصوں میں کیسے تقسیم کیا جا سکتا ہے؟

مگر میاں عبدالقدوس اپنے حساب پر ڈٹے رہے کہنے لگے۔ "تم مسلمان آدمی ہو۔ تم کیا جانوں حساب کیا ہوتا ہے۔ پہلے آدھے اور دوسرے آدھے مریضوں سے وہ مریض مراد ہیں جو بیمار ہوتے ہیں۔ جب کہ تیسرے آدھے وہ مریض ہیں جو بیمار نہیں ہوتے صرف سک لیو (رخصت علالت) لے کر گھر پڑے رہتے ہیں۔"

میاں عبدالقدوس کا حساب ٹھیک ہو یا نہ ہو' لیکن اس کے پیچھے جو مرکزی خیال ہے اس سے ہمیں سو فیصد اتفاق ہے۔ اگر کوئی مریض علاج کے بغیر بیماری سے بچ جائے تو کبھی کبھی ایسا اتفاق بھی ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر وہ عیادت اور مزاج پرسیوں کے بعد بھی بچ جائے تو یہ ایک معجزہ کہا جائے گا۔

چنانچہ اے قارئین کرام! ایک مرتبہ ہم بھی ایک معجزہ اور عجوبہ بن چکے ہیں۔ جس کی وجہ یہ تھی کہ ہم ایک ہفتے تک عیادت جھیلتے رہے۔ پھر بھی زندہ بچ گئے۔ ان دنوں میاں عبدالقدوس ہمیں یہ مشورہ دیا کرتے تھے کہ عزیزم چاہو تو کسی نمائش میں اپنا ٹکٹ لگا کر اچھی خاصی رقم کما سکتے ہو!

شروعات معمولی نزلے سے ہوئی تھی۔ مگر ہوا یہ کہ نکڑ کی دکان سے پان لیتے وقت شرماجی نے دیکھ لیا۔ بس دوڑ کر آ گئے حال پوچھنے۔

"خیریت تو ہے برخوردار! اب پان بھی کھانا شروع کر دیا؟"

"نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں چچا۔ بس ذرا نزلہ سا ہو گیا تھا۔ سوچا خوشبو والا پان ہی کھالوں۔" ہم نے وضاحت کی۔

"نزلہ اور پان؟ رام رام رام۔ بھیا ایسا غضب کبھی نہ کرنا۔ جانتے ہو' پان کھانے سے منہ کا کینسر ہو جاتا ہے۔ ٹی وی پر نہیں دیکھا تم نے؟ پان کھانے والے کینسر کے مریضوں کی کیسی کیسی گھناؤنی تصویریں دکھائی گئی ہیں!"

"اب ایک دو پان کھانے سے کیا کینسر ہو گا چچا؟"

"اماں آج ایک دو کھاؤ گے۔ کل تین چار کھانے کو جی چاہے گا اور پانچ چھ روز میں عادت پڑ جائے گی۔ اس لئے خبردار۔ پان کو کبھی ہاتھ مت لگانا۔ تمہیں نزلہ ہی ٹھیک کرنا ہے تو ایسا کرو کہ ایک تولہ نوسادر میں کالا نمک اور سفید زیرہ ملا کر کڑوے نیم کے شہد کے ساتھ صبح شام چاٹتے رہو۔ تین دن بعد نزلہ باقی رہ جائے تو نام بدل دینا۔"

ہم نے شکریہ ادا کر کے شرماجی سے پیچھا چھڑانا چاہا۔ مگر وہ بھی کچی گولیاں نہیں کھیلے تھے۔ پکڑ کر

عطار کی دکان پر لے گئے اور پورا نسخہ بند ھوا کر دم لیا۔

گھر پہنچ کر ہم نے سب لوگوں کو اکٹھا کیا اور نزلے کے بارے میں مطلع کر کے تنبیہہ کی کہ خبردار یہ خبر گھر سے باہر نہ جانے پائے' اور اگر شرما جی ہمارا حال پوچھنے آئیں تو انہیں بتایا جائے کہ ہم بالکل ٹھیک ہیں اور چڑیا گھر کی سیر کو گئے ہوئے ہیں۔

لیکن یہ سب احتیاط بے سود رہی۔ ہم شرما جی کے نسخے کی پہلی خوراک لے رہے تھے کہ رفیقن بوا نے دیکھ لیا جو محلے بھر کے قصے سمیٹ کر ہر شام ہمارے گھر آجایا کرتی تھیں۔ دیکھتے ہی بولیں۔

"ہئے ہئے۔ توبہ توبہ۔ باؤلا ہو گیا ہے کیا؟ اتنا بڑا ہو کر املی چاٹ رہا ہے!"

بوا کی پھبتی سن کر اور سب تو ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو گئے۔ مگر ہمیں ایسا تاؤ آیا کہ ساری احتیاط بھول کر انہیں بتا بیٹھے کہ یہ جو ہم چاٹ رہے ہیں وہ املی نہیں کڑوے نیم کے شہد میں نوسادر سفید نمک اور کالا زیرہ ملا ہوا ہے۔

سنتے ہی بوا کا چہرہ فق ہو گیا۔ چیخ کر بولیں۔ "ارے تو کیا کالی کھانسی ہو گئی ہے؟"

"نہیں بھئی۔ بس ذرا نزلہ سا ہو گیا ہے۔" ہم نے سمجھایا۔

"مگر یہ دوا تو کالی کھانسی کی ہے۔ اچھا سمجھ گئی تو اس موئے ناس پیٹے حکیم ناظر حسن کی دوا لے آیا ہے۔ دیکھ بیٹا جان کی خیر چاہتا ہے تو اس چٹنی کو فوراً پھینک دے اور ایسا کر کہ لال رنگ کی ہری مرچ کو اصلی دیسی گھی میں بھون کر دو تولہ سفید کھانڈ کے ساتھ پھنکی مارے۔ اللہ نے چاہا تو صبح تک سارا نزلہ بہہ جائے گا۔"

بوا کے نسخے سے نزلے کا تو پتہ نہیں کیا ہوا البتہ صبح تک کھانستے کھانستے ہمارا ضرور برا حال ہو گیا اور گھر میں عیادت کے لئے آنے والوں کا بھی تانتا لگ گیا۔ ایک صاحب نے ہماری کھانسی کو نمونے کی پہلی اسٹیج قرار دے کر پدم شری ڈاکٹر باگلے کے پاس جانے کا مشورہ دے دیا۔

مگر وہاں جانے سے پہلے ہی ایک اور صاحب نے یہ کہہ کر بستر پر لٹا دیا کہ باہر نکلے تو ہوا لگنے سے نمونیہ دمے میں بدل سکتا ہے' جیسا ہمارے ۹۰ سالہ نانا کا بدل گیا تھا۔ اس کے بعد ہم ابھی نمونیہ اور دمے سے کراہ ہی رہے تھے کہ ایک صاحب نے یہ اندیشہ ظاہر کر کے جان نکال دی کہ ہو نہ ہو یہ ٹی بی کے آثار ہیں' کیونکہ ان کی خالہ کے لڑکے کا بھی ایک سال تک نمونے کا علاج چلتا رہا تھا مگر بعد میں اسے ٹی بی نکلی تھی۔

ان عیادتوں اور مشوروں کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہمارا پورا ہفتہ نمونیہ' دمہ' ٹی بی' خفقان اور سرطان وغیرہ کے ٹیسٹ کرانے میں ختم ہو گیا مگر جب ہر ٹیسٹ میں فیل ہونے کے بعد ہم خوشی خوشی گھر آئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ایک صاحب پہلے سے ہی ہماری عیادت کے لئے آئے بیٹھے ہیں۔

جانتے ہیں کون؟

میاں عبدالقدوس!!

☆ ☆ ☆

قسمت کے کھیل نرالے

جہاں تک قسمت کا تعلق ہے تو ہم خوش قسمتی سے کافی خوش قسمت واقع ہوئے ہیں۔ کسی بات پر شرط بدنے یا داؤ لگانے کا معاملہ ہو یا ادبی معمہ بھرنے کا' گفٹ پرائز ہو یا انعامی کوپن' جوا ہو یا لاٹری' ہر جگہ قسمت اور ستاروں نے ہمارا ساتھ دیا ہے۔

حالانکہ ہم وہم پرست نہیں ہیں اور قسمت اور ستاروں کو بالکل نہیں مانتے۔ تاہم معلوم ہوتا ہے کہ قسمت اور ستارے ہمیں کافی مانتے ہیں۔ اور ان کی بدولت ہم تدبیر اور عمل کے جھنجھٹ میں پڑنے سے بچے رہتے ہیں۔

زندگی کی پہلی شرط ہم نے میونسپل چناؤ میں میاں عبدالقدوس سے لگائی تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ ہمارے حلقے سے اونٹ والا ہارے گا۔ جبکہ ہم اس پر بضد تھے کہ ترازو والا جیتے گا' بس پھر کیا تھا۔ لگ گئی دس دس روپے کی!

اس کے بعد وہی ہونا تھا جو ہوا! قسمت نے ہمارا ایسا ساتھ دیا کہ ترازو والا سچ مچ جیت گیا اور اونٹ والا ہار گیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میاں عبدالقدوس نے شرط کی آدھی رقم اپنے پاس رکھ لی' کیونکہ ان کی پیشن گوئی بھی درست نکلی تھی۔

ایک اور مرتبہ ہم سینما دیکھنے کے لئے گئے تو فلم میں گھوڑ دوڑ کا سین آگیا۔ میاں عبدالقدوس بھی ساتھ تھے۔ ہم نے فوراً موقع کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ان سے ایک مریل سے گھوڑے پر شرط بدلی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ گھوڑا جیت گیا اور میاں عبدالقدوس ہار گئے۔ دوسری طرف ہم کافی دیر تک اس اتفاق پر حیرت کرتے رہے کہ ہفتہ بھر پہلے جب وہ فلم ہم نے دیکھی تھی تب بھی وہی گھوڑا جیتا تھا!

بہر کیف اس کے بعد بھی ہم نے کئی مرتبہ وہ فلم دیکھی' ہر مرتبہ اسی گھوڑے پر داؤ لگایا اور قسمت کی بات دیکھئے کہ قسمت اور ستاروں نے ہر شو میں ہمارا ساتھ دیا!

پہلی مرتبہ جوا کھیلنے پر بھی قسمت ہم پر پوری طرح مہربان رہی اور ذرا سی دیر میں ہم نے فلیش میں ساٹھ ستر روپے جیت لئے۔ وہ تو اچھا ہوا کہ اسی وقت بجلی چلی گئی اور ڈیسو کی کارکردگی نے ہمارے دوستوں کو مزید رقم ہارنے سے بچادیا ورنہ ہم نہ جانے کتنی رقم اور جیت لیتے۔ بعد میں دوستوں نے ہمیں انتقاماً جوئے میں ہرانے کی بہت کوشش کی' لیکن ہم ایک مرتبہ بھی نہیں ہارے۔ جس کی سیدھی سی وجہ یہ تھی کہ پہلی مرتبہ جیت کے بعد ہم نے کبھی جوا نہیں کھیلا۔ ظاہر ہے' جوئے میں سو فیصد جیت کا ریکارڈ ہم کیوں خراب کرتے؟

انعامی کوپن اور گفٹ پرائز میں بھی قسمت ہمارے ساتھ رہی۔ غرض یہ کہ ہم نے جب بھی کسی ایسے معاملے میں ہاتھ ڈالا جس میں ہاتھ نہ ہلانے پڑیں' اس میں قسمت نے کم از کم پہلی مرتبہ ہمارا ساتھ ضرور دیا۔

یہ سب جاننے کے بعد ایک مرتبہ میاں عبدالقدوس کہنے لگے۔ ''میری بات مانو تو میرے عزیز کسی نوگزہ پیر کے سجادہ نشیں سے اپنے حق میں دعائے خیر کرالو!''

''دعائے خیر! مگر کیوں؟'' ہم نے حیرت سے پوچھا۔

''ایسا معلوم ہوتا ہے عزیزم کہ قسمت تمہارے پیچھے پڑ گئی ہے۔''

ان کا لہجہ ایسا تھا کہ ہم کافی دیر تک خوف سے لرزتے رہے۔

ایک دن اسی قول کو انہوں نے اس طرح دوہرایا۔ ''جن کاموں میں عمل اور تدبیر کی ہینگ یا پھٹکری استعمال نہیں کرنی پڑتی' ان میں تم ہمیشہ کامیاب رہتے ہو۔ لہٰذا میری بات مانو اور لاٹری کا ٹکٹ خرید لو۔ مجھے پورا یقین ہے کہ تمہارا انعام ضرور بالضرور نکلے گا۔''

لیکن ہم نے مشورہ قبول نہیں کیا۔ اس میں ہماری اپنی کئی مصلحتیں تھیں۔ ایک روز انہوں نے بہت اصرار کیا تو ہم نے دل کی بات کہہ ہی دی!

ہم نے کہا ''خاں صاحب' لاٹری کا ٹکٹ تو ہم خرید لیں لیکن ایک بات سے ڈر لگتا ہے۔ کہیں ہمارا پہلا انعام نہ نکل آئے!''

خاں صاحب نے ہمیں اوپر سے نیچے تک غور سے دیکھا اور بولے۔ ''میاں لوگ تو لاٹری میں انعام پانے کے لئے سیکڑوں جتن کرتے ہیں بلکہ کبھی کبھی تو پوری تنخواہ لاٹری میں جھونک دیتے ہیں۔ اور تم ہو کہ انعام نکلنے سے ڈر رہے ہو!''

اس پر انہیں ہم نے سمجھایا۔ ''معاف کیجئے خاں صاحب یوں تو آپ ہم سے زیادہ ذی فہم اور ذکی

عقل ہیں لیکن اس معاملے میں آپ چوک گئے۔ کیا آپ اتنا بھی نہیں سمجھتے کہ لاٹری کا پہلا انعام نکلنے سے کتنا مالی نقصان ہوتا ہے۔''

''مالی نقصان!؟'' انہوں نے کہا اور ہمیں حیرت سے اس طرح دیکھنے لگے جیسے ہمارے سر پر سینگ نکل آئے ہوں۔ یہی نہیں اس کے بعد انہوں نے ہمارا دایاں ہاتھ بھی پکڑا اور چند لمحوں تک نبض ٹٹولنے کے بعد سرگوشی کے انداز میں بولے۔ ''اچھا!۔ تو کیا لاٹری کا پہلا انعام نکلنے سے نقصان بھی ہوتا ہے!''

''جی ہاں! اور یہی وہ نکتے کی بات ہے جس کی طرف لاٹری کے شوقین کبھی توجہ نہیں دیتے۔'' ہم نے پورے جوش و خروش کے ساتھ انہیں سمجھاتے ہوئے کہا۔ ''اب ذرا غور کیجئے' سب سے بڑی قباحت پہلا انعام نکلنے میں یہ ہے کہ انعام کا ایک بڑا حصہ سرکاری خزانہ میں چلا جاتا ہے۔ پھر ڈسٹری بیوٹر بھی اپنا حصہ کاٹ لیتا ہے اور ٹکٹ بیچنے والا الگ سے اچھی خاصی رقم بطور کمیشن لے لیتا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اگر پہلے انعام کی رقم ۵۰ لاکھ روپے ہو تو مشکل سے ۲۵' ۳۰ لاکھ روپے پلے پڑتے ہیں۔ اور باقی رقم دوسرے اخراجات میں چلی جاتی ہے۔ اب آپ ہی بتائیے اپنی ہی جیب سے پانچ روپے کا ٹکٹ خرید کر بیٹھے بٹھائے لاکھوں روپے کا نقصان اٹھالینا کہاں کی دانش مندی ہے؟''

بات خاں صاحب کی سمجھ میں آگئی اور وہ حیرت سے آنکھیں جھپکانے لگے۔ لیکن اگلے روز وہ اس مشکل کا ایک حل لے کر آگئے۔ کہنے لگے۔ ''دیکھو میرے عزیز۔ لاٹری کا ٹکٹ پانچ روپے کا ہے۔ پہلا انعام نکلنے پر چونکہ چالیس فیصد رقم کٹ جائے گی۔ لہٰذا اس نقصان کو پورا کرنے کے لئے ٹکٹ کی قیمت کا ۴۰ فیصد حصہ یعنی دو روپے میں ادا کئے دیتا ہوں۔ باقی جو ۶۰ فیصد فائدہ ہوگا اس کے لئے تین روپے تم ادا کردو۔ اس طرح جو لاکھوں کا نقصان ہوگا وہ میرے حصے میں رہے گا۔ اور باقی رہی تمہاری رقم وہ ہم دونوں آدھی آدھی بانٹ لیں گے۔ کیا سمجھے!؟''

اب حیرت سے پلکیں جھپکانے کی ہماری باری تھی۔ مسئلے کا حل اتنا آسان ہو سکتا ہے یہ تو ہم نے سوچا بھی نہیں تھا۔

میاں عبدالقدوس کی اس منطق کا ہم پر اتنا گہرا اثر ہوا کہ کافی دیر تک فرط خوشی سے کانپتے رہے اور اچھی طرح کانپ لینے کے بعد بازار جاکر ۵۰ لاکھ کی لاٹری کا ایک ٹکٹ خرید لائے' جس میں دو روپے کی پارٹنرشپ خاں صاحب کی تھی۔

اس کے بعد لاٹری کا نتیجہ نکلنے میں حالانکہ تین ہفتے باقی تھے' مگر ہمارے حالات اسی دن سے بدلنا شروع ہوگئے۔

سب سے پہلی تبدیلی یہ آئی کہ رکشہ تانگہ اور لوکل بس جیسی سواریوں کا سفر چھوٹ گیا۔ ہم

روزگار بنالیا۔ ابھی معاملہ کچھ آگے بڑھا ہی تھا کہ نہ جانے کس طرف سے اردو صحافت نے آکر آغوش میں لے لیا اور کسی امربیل کی طرح پورے وجود سے لپٹ گئی۔ شاید یہی دیکھ کر شاعری نے دھڑ سے اپنے دورازے بند کرلیے اور ایک شاعر، سابق شاعر بن گیا۔

اسی کے عشرے کی پہلی تاریخ سے زندگی کا دوسرا سفر، دہلی میں شروع ہوا۔ روزنامہ ملاپ، تیج، سن میگزین، ریڈرس ڈائجسٹ والوں کے سرودتم ہندی ڈائجسٹ اور ریڈیو وغیرہ میں جم کر کام کیا، جون ۱۹۸۷ء میں ان دیکھے ہاتھوں نے کان پکڑ کر روزنامہ قومی آواز نئی دہلی کے دفتر میں رپورٹر بنا کر بٹھادیا اور ابھی وہاں کام کرتے ہوئے چند مہینے ہی ہوئے تھے کہ ایک عجیب بات ہوگئی۔

دہلی کی عام زندگی پر "دہلی ڈائری" کے عنوان سے ایک عامیانہ سا ہفتہ وار کالم لکھنے لکھتے محسوس ہوا کہ کچھ لوگ اسے پڑھ کر ہنس رہے ہیں۔ پہلے تو سوچا کہ شاید کچھ غلطی ہوگئی ہے مگر پھر لوگوں نے پکڑ پکڑ کر یقین دلایا کہ بھئی آپ تو خاصے مزاح نگار جیسے کچھ ہوگئے ہیں، خدا خیر کرے!

آنکھیں مل کر دیکھا تو پایا کہ واقعی، دہلی ڈائری کچھ سے کچھ اور ہوگئی تھی۔ یہ سلسلہ چلتا رہا۔ بالا خر جولائی ۱۹۸۸ء سے روزانہ طنزومزاح کا ایک کالم "تحت اللفظ" کے عنوان سے لکھنا شروع کیا۔ کالم اتنا مشہور ہوا کہ چھ ماہ میں ہی دہلی کے کل ہند طنز و مزاح سیمینار میں اس نو آموز مصنف کو بڑے بڑے جغادری مزاح نگاروں کے ساتھ بٹھادیا گیا اور ٹیلی ویژن والوں نے خود بلا کر انٹرویو لیا۔ ایک شریف پبلشر[1] نے "تحت اللفظ" کے منتخبہ مضامین اسی نام سے کتاب کی شکل میں چھاپ دیئے۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ دہلی اردو اکادمی نے کچھ لوگوں کے بقول مقبولیت سے ڈر کر، کچھ دوسروں کے بغور مجبوری میں اور کچھ تیسروں کے بقول غلطی سے اسے ۱۹۹۲ء کی بہترین مزاحیہ کتاب کا نقد انعام دے دیا، جس کے بعد باقی ماندہ چوتھے لوگوں نے کہا---

یہ سال کا بہترین مذاق ہے!

بس یہ تھوڑے سے حالات ہیں، جو آگے نہ جانے کہاں لے جانے والے ہیں۔

...اور ہم

حضرت شیکسپیئر نے کہا تھا، نام میں کیا دھرا ہے؟

[1] بشیر احمد صاحب "چنگاری" والے

سوچنے لگے کہ جب انعام میں لاکھوں روپے کی رقم ملے گی تو اسے خرچ کرنے کے لئے سب سے پہلے ایک اچھی سی کار خریدنی پڑے گی۔ لہٰذا کیوں نہ ابھی سے ادنیٰ سواریوں میں سفر نہ کرنے کی عادت ڈال لی جائے۔ تھوڑا سا اور سوچا تو خیال آیا کہ ڈرائیونگ سیکھ لینا بھی مفید رہے گا۔ پتہ نہیں بعد میں لاکھوں روپے خرچ کرتے وقت اس کے لئے فرصت ملے نہ ملے۔ پس ہم نے مزید سوچنا بند کیا اور پانچ سو روپے خرچ کر کے ایک کار ڈرائیونگ اسکول میں داخلہ لے لیا' جس کی تربیت سے دو ہفتوں میں محض چار پانچ چھوٹے بڑے حادثوں کے بعد ہم کار اسٹارٹ کرنا بخوبی سیکھ گئے۔

لیکن اس سے پہلے کہ مزید حادثوں کے بعد کار کے بریک لگانا سیکھ پاتے ایک روز ذرا سی فرصت ملی اور ہم پھر سوچنے بیٹھ گئے۔ خیال آیا کہ جب کار خریدیں گے تو ڈرائیور بھی رکھا جا سکتا ہے۔ اس لئے ہم کیوں خواہ مخواہ لوگوں سے ٹکراتے پھریں۔ یہ کام ڈرائیور ہم سے کہیں زیادہ مہارت اور خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دے سکتا ہے۔ اس خیال کے آتے ہی ہم نے آؤ دیکھا نہ تاؤ' ڈرائیونگ اسکول کی ٹوٹی پھوٹی کاروں کی مرمت کا چند ہزار روپوں کا بل ادا کیا اور داخلہ منسوخ کرا دیا۔ بعد میں ہم نے نوٹ کیا کہ ہمارے پڑوسی نہ جانے کیوں کافی خوش نظر آنے لگے تھے۔ بلکہ ایک دو نے تو ہمیں گھر پر چائے پینے کی دعوت بھی دی!

بہرکیف اس دوران اور بھی کئی باتیں ہوئیں۔ مثلاً ایک روز ہمیں گھر میں لیٹے لیٹے خیال آیا کہ ہمارے کرایہ کے مکان کی چھت کافی نیچی ہے اور دیواریں خاصی تنگ ہیں۔ اور یہ کہ ہم جو اپنے گھر میں کھل کر یا کھڑے ہو کر کبھی انگڑائی نہیں لیتے تو اس لاشعوری احتیاط کے پیچھے دراصل یہ شعوری اندیشہ تحت الشعور میں چھپا رہتا ہے کہ کہیں دائیں بائیں الماریوں میں رکھے قیمتی ٹی سیٹ نہ گر جائیں اور کہیں بجلی کے پنکھے سے سر نہ ٹکرا جائے۔ یہ بات سمجھ میں آتے ہی ہم سیدھے ایک پراپرٹی ڈیلر کے یہاں پہنچے اور بڑی محنت سے اپنی انگڑائیوں اور جمائیوں کی ناپ کا ایک کشادہ فلیٹ ڈھونڈنے میں کامیاب ہو گئے۔ جس کا کرایہ دو ہزار روپے ماہوار اور قیمت پانچ لاکھ روپے تھی۔ ہم نے پراپرٹی ڈیلر کو ایک ماہ کا کرایہ پیشگی دیا اور اگلے مہینے ۲۰ سال کا کرایہ پیشگی ادا کرنے کے بعد فلیٹ میں شفٹ ہونے کا وعدہ کر کے اطمینان کی سیٹی بجاتے ہوئے گھر آ گئے۔

ایک دن اور اسی طرح سوچنے بیٹھے تو خیال آیا کہ کار بھی ہو گئی ڈرائیور بھی ہو گیا اور اچھا سا گھر بھی مل گیا' تو پھر کیوں نہ ایک عدد اچھی سی گھر والی کا بھی انتظام کر لیا جائے۔ چنانچہ کچھ رقم اور خرچ کی گئی اور تمام اخبارات میں ضرورت رشتہ کے اشتہار دے دیئے گئے۔ خیال تھا کہ لاکھ دو لاکھ شادی کی تقریب سعید پر خرچ ہو جائیں گے مگر جب حساب لگایا تو کئی لاکھ روپے اب بھی بچتے تھے۔ لہٰذا اب نہیں ٹھکانے لگانے کی ترکیبیں سوچی گئیں۔ ہمارا تو خیال تھا کہ یہ رقم لاٹری والے کو بطور انعام دے کر باقی عمر یاد خدا

میں گذار دیں گے مگر میاں عبدالقدوس نے یہ آئیڈیا فوراً رجیکٹ کردیا۔ کہنے لگے۔ جب ایک عدد بیوی بھی سادہ لاؤ گے تو ایک عدد ٹی وی بھی رنگین لے آنا۔ اور جب ٹی وی لوگے تو ایک عدد وی سی آر' ایک تھری ان ون' ایک ٹو ان ون اور ایک ون ان ون بھی لے لینا' اس کے بعد جو رقم بچے وہ بلا سودی بنک کاری کرنے والی کسی اسلامی امدادی سوسائٹی میں فکسڈ ڈپازٹ کرادینا۔ بس قصہ ختم!

"اور اگر پھر بھی کچھ رقم بچ گئی تو!؟" ہم نے پوچھا۔

"تو... تو... ایک شادی اور کرلینا۔"

اس طرح تمام رقم ٹھکانے لگ جانے کے بعد ہم نے چین کا سانس لیا اور بے تابی سے لاٹری کے نتیجے کا انتظار کرنے لگے۔

اس دوران ہم نے سوچنا بالکل بند کردیا۔ اگر کبھی کچھ سوچنے کی حاجت ہوتی بھی' تو فوراً لاحول پڑھ کر سر پر ٹھنڈے پانی کا لوٹا ڈال لیتے۔

خدا خدا کرکے نتیجے کا دن آیا۔ دھڑکتے دل کے ساتھ ہم نے صبح کا اخبار ہاتھ میں لیا۔ اور لاٹری کا نتیجہ ڈھونڈنے لگے۔ بڑی تلاش کے بعد پہلے ہی پیج پر نتیجہ مل گیا اور نتیجہ پڑھتے ہی فرط مسرت سے ہمارے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔

قسمت ہم پر ایک بار پھر مہربان ہوگئی تھی۔ ہمارا انعام سچ مچ نکل آیا تھا!

ہاں یہ ضرور ہے کہ وہ ۵۰ لاکھ روپے کا پہلا نہیں بلکہ ایک لاکھ روپے کا ساتواں انعام تھا جس کی رقم دو ہزار لوگوں میں برابر برابر تقسیم کی جانی تھی اور ہمارے حصہ میں ۵۰ روپے نقد یا اس کے عوض اگلی لاٹری کے ایک درجن ٹکٹ مفت ملنے والے تھے۔

اگلے روز حواس بحال ہونے پر ہم نے حساب لگایا تو پایا کہ تین روپے خرچ کرکے ہم نے صرف ۵۰ روپے کا فائدہ اور پانچ ہزار روپے کا نقصان کمایا تھا۔ اس کے علاوہ کوئی ٹھوس فائدہ ہوا تو صرف یہ کہ جن صاحبہ سے ہمارا رشتہ طے ہوا تھا انہوں نے لاٹری کا نتیجہ معلوم ہوتے ہی رشتہ توڑ دیا!

☆ ☆ ☆

چلتی کا نام گاڑی

اقوام متحدہ کے بس کا اور کچھ ہو یا نہ ہو آئے دن کوئی نہ کوئی دن ضرور مناتی رہتی ہے۔ بچوں کے لئے عالمی یوم اطفال، بوڑھوں کے لئے عالمی یوم بزرگان، عورتوں کے لئے عالمی یوم خواتین وغیرہ (مردوں یعنی مرد کی جمع کا کوئی دن نہیں ہوتا، افسوس!)۔

اسی طرح یوم نباتات، یوم حیوانات، یوم ماحولیات اور کئی دوسرے یوم ہوتے ہیں جن کے آخر میں آت آتا ہے اور جو قارئین کی خوش قسمتی سے اس وقت ہمیں یاد نہیں آرہے ہیں۔

چند برسوں سے بیماریوں کا فیشن چل نکلا ہے چنانچہ یوم چیچک اور یوم تپ دق کے بعد اب یوم سرطان اور یوم ایڈس بھی منائے جانے لگے ہیں۔ حال ہی میں یوم ذیابیطس کا بھی اضافہ ہو گیا ہے۔

اقوام متحدہ یہ طرح طرح کے دن کس لئے مناتی ہے ابھی تک پوری طرح واضح نہیں ہو پایا ہے، شاید اس لئے کہ ہر دن سے دنیا والوں کو اپنے مسئلوں کا ایک کے بعد ایک، احساس ہوتا رہے اور وہ ایک دوسرے سے کہتے رہیں۔

"میاں بچے جائیں بھاڑ میں اور یوم اطفال بھی! کم بخت دن بھر گلی ڈنڈا اور کنچے کھیلتے رہتے ہیں۔ اب تو بوڑھوں کی فکر کرو۔ آج بزرگوں کا دن ہے۔ اف یوم بزرگان۔"

پھر جب بزرگوں کا دن گذر جائے گا تو کوئی یہ کہے گا۔ "اجی بوڑھوں کو ان کے حال پر چھوڑیئے۔ ایک دن سبھی کو دنیا سے جانا ہے۔ آج تم کل ہماری باری ہے۔ اور جائیں گے جب یہاں سے کچھ بھی نہ پاس ہوگا۔ اور سکندر جب گیا دنیا سے دونوں ہاتھ خالی تھے۔ مجھے تو جناب عورتوں کی فکر کھائے جا رہی ہے۔ بے چاری کیا کیا سہ جاتی ہیں۔ ہائے! دیکھئے تو سہی سڑک پر کتنی حسین خواتین گذر

رہی ہیں۔ کیا جسم ہے۔ کیا چال ہے۔ ہائے یوم خواتین!''

عورتوں کے دن کے بعد ابھی ان کے مسئلے حل بھی نہ ہوں گے کہ کافی ہاؤس کی کسی میز پر سنائی دے گا۔

''اماں چھوڑیئے عورتوں کو۔ وہ تو خود ایک مسئلہ ہیں۔ عورتوں سے زیادہ مجھے حیوانات کا غم ہے۔ آج یوم حیوانات ہے اور مجھے بے چارے وہ جانور یاد آرہے ہیں جو آج تک حقوق انسانی سے محروم ہیں آہ یوم حیوانات!''

غرض یہ کہ دن گذرتے رہیں گے' مسئلے اچھلتے رہیں گے اور نہ یہ ختم ہوں گے نہ وہ!

میاں عبدالقدوس کا کہنا ہے کہ اقوام متحدہ یہ عالمی دن عالمی مسئلوں کے لئے نہیں خود اپنے لئے مناتی ہے۔

''اپنے لئے کیوں؟'' ہم نے پوچھا۔

''تاکہ اس کی موجودگی کا احساس باقی رہے اور جب بھی کوئی عالمی دن آئے تو لوگ چونک کر ایک دوسرے سے کہہ اٹھیں۔ اوہو بھئی اقوام متحدہ بھی خوب چیز ہے۔ ابھی تک چل رہی ہے۔ اور دوسرا جواب میں کہے جی ہاں چل رہی ہے اور بے آواز ہے۔ جب تک بش صاحب سواری نہ کریں اور ہارن نہ بجائیں بے چاری بے آواز ہی رہتی ہے۔''

خیر' عالمی دنوں سے مسئلے حل ہوں یا نہ ہوں' لوگ اقوام متحدہ کو یاد کریں یا نہ کریں' ایک بات طے ہے' اور وہ یہ کہ اقوام متحدہ کا کیلنڈر بڑی تیزی سے بھرتا جارہا ہے۔ مشکل یہ ہے کہ دنیا کے مسئلے ہزار ہیں اور سال کے دن صرف تین سو پینسٹھ۔ کیلنڈر میں اب بہت کم غیر عالمی دن باقی رہ گئے ہیں۔ اور یہ حال تب ہے جب عالمی دنوں کے رواج کو پندرہ بیس سال سے زیادہ نہیں ہوئے۔

پہلے اقوام متحدہ دہائی منانے میں یقین رکھتی تھی۔ چنانچہ عورتوں کی دہائی آپ کو یاد ہوگی (یہاں دہائی سے عشرہ مراد ہے' وہ نہیں جو عورتیں اکثر دیا کرتی ہیں)۔ لیکن پتہ چلا کہ مسئلے اور بھی ہیں۔ تب سال منائے جانے لگے۔ اور جب سالوں (برسوں) سے بھی پورا نہیں پڑا تو دن منانے کا سسٹم چلایا گیا۔ چنانچہ اب یہ مسئلہ آئے گا کہ جب مسئلے ۳۶۵ ہو جائیں تو کیا منایا جائے؟

یہ سوال ہم نے میاں عبدالقدوس کے سامنے رکھا تو انہوں نے حقے کا ایک طویل کش لے کر فرمایا۔ ''جواب آسان ہے۔ جب دن ختم ہو جائیں تو عالمی رات شروع کردی جائے۔ مثلاً شب پولس' شب ٹریفک' شب جرائم' شب بیداری' شب فراق' شب وصال' شب دیجور شب ہجر عرف شب

ے ''آج کل کشتن صاحب

مہاجرین وغیرہ' ہزاروں شیس ہیں۔"

"مگر سال بھر میں صرف تین سو پینسٹھ شیس ہی آئیں گی جناب!" ہم نے انہیں مشکل میں ڈالنے کے لئے کہا۔

"تو ہر مسلے کی صبح شام اور دوپہر بھی منائی جاسکتی ہے۔" انہوں نے اطمینان سے کہا۔

"اور اس کے بعد۔" ہم نے پھر چھیڑا۔

"اس کے بعد اقوام متحدہ کو عالمی گھنٹے منانے پڑیں گے اور ہر دن ہزار گھنٹے کا ڈکلیئر کرنا پڑے گا!" انہوں نے مزید اطمینان سے کہا اور ہم بالآخر لاجواب ہو گئے!

ایک مرتبہ جب عالمی یوم ذیابیطس منایا گیا تو یہ جان کر بڑی مایوسی ہوئی کہ ہم اس دن کو منانے کے اہل نہیں ہیں۔ یہ بات نہیں کہ جسے شوگر کی بیماری نہ ہو وہ اس عالمی دن کو کسی طرح منا ہی نہیں سکتا۔ منا سکتا ہے۔ لیکن ظاہر ہے جو خشوع و خضوع شوگر کے مریض کے منانے میں ہو گا وہ بھلا غیر مریض (جو مریض نہ ہو) کے منانے میں کہاں آسکتا ہے۔

شوگر کا مریض تو جناب اس روز پاک صاف ہو کر انسولن کا انجکشن لے گا' پھیکی چاء کے ساتھ ناشتہ کرے گا۔ ڈاکٹر کے پاس یا اسپتال جا کر اپنا معائنہ کرائے گا۔ مٹھائی کی دکانوں کے سامنے کھڑے ہو کر گلاب جامن' جلیبی' رس گلے اور امرتی کے مرتبانوں پر حسرت بھری نگاہ ڈالتا پھرے گا وغیرہ وغیرہ۔ جب کہ ہم جیسا غیر مریض (تشریح اوپر آچکی ہے) اس روز اخبار میں یوم ذیابیطس پر ایک آدھ مضمون پڑھ کر یا ریڈیو ٹی وی پر کوئی پروگرام دیکھ سن کر اپنی معلومات میں چند اعداد و شمار کا اضافہ کرے گا اور منہ پر ہاتھ رکھ کر جمائیاں لیتے لیتے سو جائے گا۔

پتہ نہیں کیوں ذیابیطس سے ہمیں بچپن سے ہی والہانہ لگاؤ رہا ہے۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب ہم اس بات سے بے خبر تھے کہ اس کے مریض کو مٹھائی سے دور رہنا پڑتا ہے۔ تب ہم ذیابیطس کو بیماری سے زیادہ کسی یونانی فلسفی کا نام سمجھتے تھے اور کئی مرتبہ امتحان کی کاپی میں ممتحن پر رعب ڈالنے کے لئے اپنی طرف سے اقوال زریں گھڑ کر لکھ دیتے تھے کہ یہ لاجواب بات مشہور فلسفی حکیم ذیابیطس خان نے کہی ہے۔

اور تو اور ہمیں اس کا صحیح املا بھی نہ آتا تھا۔ ان دنوں ہمارا رجحان املا کی طرف کم املی چاٹ کی طرف زیادہ تھا۔ چنانچہ حکیم جالینوس کو حکیم جعلی نوس لکھ جاتے تھے۔ ذیابیطس کو اکثر ضیابیطس لکھ دیتے

کہ ہمارے ایک دوست ہاشم علی کا تخلص بھی ضیاء تھا۔ بلکہ کبھی کبھی تو ضیا بیطس بھی لکھ دیتے تھے۔ وہ تو بھلا ہو حکیم ضمیر کا جنھوں نے ہمیں اس کا صحیح املا بتا دیا۔ یہ اس دن کی بات ہے جب ہمیں پہلی بار معلوم ہوا تھا کہ حکیم ذیابیطس کوئی فلسفی نہیں بیماری ہے۔

ان دنوں ہمیں بیماریوں کا بڑا شوق تھا۔ بلکہ سچ پوچھئے تو بیماریاں صرف آڑ تھیں۔ شوق دراصل ہمیں میٹھی اور لذیز یونانی ادویات کا تھا۔ چنانچہ جیسے ہی پتہ چلا کہ ذیابیطس ایک نئی بیماری آئی ہوئی ہے' تو یہ جانے بغیر کہ اس کے مریض کو میٹھے سے پرہیز کرنا پڑتا ہے' ہم اسکول سے دوڑے دوڑے حکیم ضمیر کی دکان پر پہنچے اور بولے۔

"حکیم صاحب کل سے پیٹ اور سینے میں سخت ذیابیطس ہے۔ جلدی سے کوئی اچھا سا خمیرہ اور مربہ باندھ دیجئے۔"

حکیم ضمیر نے پہلے تو ہمیں مشکوک نگاہوں سے دیکھا پھر بولے۔ "کیا کہا؟ ذیابیطس؟" ہم نے کہا "جی ہاں" تو پوچھا "ذال سے یا ظوئے سے؟"

جلدی میں ہمارے منھ سے نکل گیا' ظوئے سے۔ یہ کہنا تھا کہ ان کا پارہ چڑھ گیا۔ بولے

"اچھا' صاحبزادے اب جھوٹ بھی بولنے لگے ہو؟ آج ہی بابو جی (ہمارے والد) سے تمہاری شکایت کرتا ہوں کہ تم کس طرح ان کی گاڑھی کمائی غلط املے والی بیماریوں پر خرچ کرتے پھر رہے ہو۔"

مگر ذکر ہو رہا تھا اقوام متحدہ کے ذیابیطس کا۔

ایک دفعہ ۲۷ جون کو یوم ذیابیطس پر ہم میاں عبدالقدوس کے یہاں پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ موصوف کھانے کی میز پر طرح طرح کی مٹھائیاں سجائے بیٹھے ہیں۔ گلاب جامن' جلیبی' رس گلے اور امرتی کے علاوہ گھیور' بالوشاہی' حلوہ سوہن' لڈو' ربڑی ملائی' چم چم اور برفی کی پلیٹیں بھی رکھی تھیں۔

ہم نے کہا۔ "خاں صاحب ہم جانتے ہیں کہ آپ کو شوگر کا مرض نہیں۔ لیکن یوم ذیابیطس منانے کا یہ کیا طریقہ ہوا؟"

کہنے لگے۔ "یوم ذیابیطس کون کم بخت منا رہا ہے میں تو اس کی آڑ میں اقوام متحدہ کے خلاف مظاہرہ کر رہا ہوں۔"

"مظاہرہ کیوں؟" ہم نے پوچھا۔

ہاشم ضیاء سہارنپوری کا ذکر کرتے ہوئے کلیجہ منھ کو آتا ہے۔ ایک خوبصورت' خوب سیرت ذہین کم گو اور سنجیدہ شاعر' عالم شباب میں کرفیو کے دوران داغ مفارقت دے کر بیوی بچوں اور دوستوں کو روتا بلکتا چھوڑ جائے تو اس کے ذکر پر کیسے نہ کلیجہ منھ کو آئے!

وہ بولے۔ ”اس لئے کے عراق میں جو کچھ ہوا اس کے بعد اقوام متحدہ پر سے میرا اعتماد اٹھ گیا ہے۔ میرا خیال ہے اسے خود شوگر کا مرض ہے۔“ یہ کہہ کر انہوں نے احتجاجاً کئی رس گلے منہ میں رکھ لئے!

اسی طرح ایک مرتبہ میاں عبدالقدوس اپنے سامنے دس آدمیوں کا کھانا لئے بیٹھے تھے۔ وسیع و عریض دسترخوان طرح طرح کے لذیذ و مرغن کھانوں سے سجا ہوا نہیں بلکہ بھرا ہوا تھا۔ قورمہ، بریانی، کوفتے، کباب، مرغ مسلم، کلیجی، بکرے کی ران اور تلی ہوئی مچھلی گوشہ نان و بیچ میں تھیں تو سبزی والے کونے میں شلغم گوشت، گوبھی گوشت، پالک گوشت، آلو قیمہ اور گاجر قیمہ کی پلیٹیں رکھی ہوئی تھیں۔ ان سے جو جگہ خالی بچی تھی وہ بھی مختلف کھانوں سے بھری تھی۔

”الٰہی خیر۔ یہ کیا ماجرا ہے خاں صاحب؟“ میں نے پوچھا۔

مرغ کی ٹانگ اور مچھلی کے پیٹ سے راستہ بنا کر نکلتی ہوئی پھنسی پھنسی آواز آئی ”قحط نہیں!“

”خدا کی پناہ! اتنا سارا کچھ نہیں ہے؟“ حیرت سے ہمارا منہ کھلا رہ گیا۔

یہ سنتے ہی ان کا تیزی سے چلتا ہوا منہ کچھ دیر کے لئے رکا۔ پہلے آنکھوں سے پورا زور لگا کر ہمیں گھورا پھر مرغ و ماہی کو معدے میں دفن کر کے بولے۔

”تمہیں کیا تکلیف ہے، نظر کیوں لگا رہے ہوں؟“

”مجھے تو کوئی تکلیف نہیں خان صاحب لیکن اتنا سب اکیلے کھائیں گے تو آپ کو ضرور ہو جائے گی۔ یہ آخر کر کیا رہے ہیں آپ؟“ ہم نے پوچھا۔

”عالمی یوم خوراک منا رہا ہوں اور کیا؟ اگر تمہاری رال ٹپک رہی ہے تو تم بھی منالو۔ میں روک تھوڑا ہی رہا ہوں۔“ وہ بکرے کی ران اپنی طرف سرکاتے ہوئے بولے۔

”تواضع کے لئے شکریہ۔“ ہم نے ایک شامی کباب اٹھا کر کہا۔ ”لیکن معاف کیجئے اقوام متحدہ نے اگر آج کے دن کو عالمی یوم خوراک ڈکلیئر کیا ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ آپ دنیا بھر کی چیزیں کھانے بیٹھ جائیں۔ یوم خوراک منانے کا مقصد یہ ہے کہ آپ افریقہ اور دوسرے غریب ملکوں میں غذائی قلت اور بھکمری کی طرف توجہ دیں۔ خوراک کے مسئلے پر غور کریں، اس کا کوئی حل تجویز کریں۔“

”اچھا تو تم چاہتے ہو کہ میں ایک بے عمل انسان بن جاؤں۔ دانشوری شروع کردوں۔ اور ہر وقت بس غور کرتا رہوں۔ جی نہیں۔ میں تاریخ میں اپنا نام محمد غوری کی بجائے محمود غزنوی کے ساتھ لکھوانا پسند کروں گا جو غور کم اور عمل زیادہ کرتا تھا۔“ وہ بکرے کی ران ادھیڑتے ہوئے بولے۔

”اس حساب سے تو خان صاحب آپ آج ہی کیوں، پورے سال ہی یوم خوراک مناتے رہتے ہیں۔ باقی دنوں میں بھی آپ کا دسترخوان ماشاء اللہ خوب بھرا رہتا ہے آج کیا خاص بات ہے؟“

"آج میں عالمی یوم خوراک منا رہا ہوں۔" وہ سینہ پھلا کر بولے۔

"لیکن آپ کا دسترخوان تو عالمی نظر نہیں آتا۔ اس کے تو تمام کھانے ہندستانی ہیں۔" ہم نے چٹکی لی۔

"تو میرے دسترخوان کو کیا تم نے عالمی اردو کانفرس سمجھ رکھا ہے جس میں دنیا کے کسی بھی کھونٹ سے غیر ادیب اور غیر شاعر آدمی بلا کر بٹھا لیا جاتا ہے۔ میں ہندوستانی ہوں پیارے بھائی اور مجھے اس پر فخر ہے۔ ویسے اگر غور سے دیکھو تو کئی غیر ملکی کھانے بھی یہاں رکھے ہوئے ہیں جنہیں ہندو میاں نے خالص ہندستانی ڈھنگ سے پکایا ہے۔"

"معاف کیجئے۔ ہمیں تو یہاں کوئی غیر ملکی ڈش دکھائی نہیں دیتی۔"

"یہ قورمہ بریانی اور کوفتے کی مغلائی ڈشیں کیا ہندستانی ہیں؟ یہ سب مغلوں کی لائی ہوئی ترکاریاں ہیں اور مغل تم جانتے ہو باہر سے آئے تھے۔ ہاں البتہ تم یہ کہہ سکتے ہو کہ ہم نے سب غیر ملکی ڈشیں ہندوستانی ڈھنگ سے پکائی ہیں۔ یہ دیکھو۔ یہ ہے چینی ڈش چاء من۔" انہوں نے سویوں کے پیالے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"لیکن یہ تو شیر معلوم ہوتی ہے اور اس میں دودھ بھی ہے۔ شاید میٹھی بھی ہوگی۔ جبکہ چاء من نمکین اور تیز مرچوں اور سرکے والا ہوتا ہے۔"

"میں نے کہا نا۔ یہ ہندوستانی طرح کا چاء من ہے۔ اور اس میں چینی اس لئے ڈالی گئی ہے کہ یہ چینی ڈش ہے۔"

"اوہ!"

"اور یہ ہے سی فوڈ جو انگلینڈ اور امریکہ میں شوق سے کھایا جاتا ہے۔" ان کا اشارہ تلی ہوئی مچھلی کی طرف تھا۔

"مان گئے خان صاحب۔ آپ واقعی جینئس ہیں۔ اچھا چلئے یہ بتایئے' عالمی یوم خوراک پر آپ دنیا کے لوگوں کو کیا پیغام دینا چاہیں گے۔"

یہ سنتے ہی خان صاحب نے مسالے سے سنے ہوئے ہاتھ اور ہونٹ تولئے سے پونچھے' جیب سے آئینہ نکال کر اس میں اپنی شکل کو غور سے دیکھا' اور جب مطمئن ہوگئے تو اسے جیب میں واپس رکھ کر بولے۔

"اس موقع پر دنیا کو میرا صرف ایک پیغام ہے۔ اور وہ یہ کہ ہمیں خوراک کا عالمی دن ہی نہیں رات بھی منانی چاہئے۔"

یہ کہہ کر وہ پھر دسترخوان پر ٹوٹ پڑے۔

کوئی ایک گھنٹے بعد تولیہ جھٹنے رومال سے منہ پونچھتے ہوئے بولے "اقوام متحدہ ہر طرح کے عالمی دن مناتی ہے۔ حتیٰ کے ایک دن خود اس کا اپنا بھی ہے۔ یوم یو این او۔ لیکن ایک اور دن منانے کا خیال اسے نہیں آیا ہے۔ جس کا منانا میرے خیال سے ازحد ضروری ہے جانتے ہو وہ دن کون سا ہے؟"

ہم نے حسب عادت ان کا سوال مکمل ہونے سے پہلے ہی نفی میں سر ہلا دیا۔ یہ دیکھ کر وہ قدرے مطمئن ہوئے اور بولے۔۔

"وہ دن ہے عالمی دنوں کا دن۔ یعنی یوم الایام!"

ایک فائدہ اقوام متحدہ کے دنوں کا اور ہے۔ یہ فائدہ وہ ہے جس سے دفتروں میں چھٹیاں لینے کے بہانے ڈھونڈنے والے حضرات خوب خوب فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ اب ہر ہفتے تو آپ چچا بھتیجوں یا خالہ پھوپھی کو بیمار اور نانا کے ہم زلف یا دادا کے برادر نسبتی کو راہی ملک عدم نہیں کر سکتے نا! کبھی کبھی جینوئن بہانوں کی بھی ضرورت پڑ جاتی ہے۔ ایسے بہانے جن کی صداقت کی تصدیق کے لئے قسمیں نہ کھانی پڑیں اور گواہ نہ لانے پڑیں۔ یہاں اقوام متحدہ بہت کام آتی ہے۔

مثلاً ایک مرتبہ جب ایک مشاعرے میں شرکت کا دعوت نامہ ملا تو ہمیں دفتر سے چھٹی لینے کا بہانہ ڈھونڈنے کے لئے ذرا بھی محنت نہیں کرنی پڑی۔ چھٹیوں کی نوٹ بک میں یہ دیکھنے کے بعد کہ ہمارے خاندان کے نصف سے زائد بزرگ کالی کھانسی، پیلے بخار اور سرخ دانوں جیسی آفتوں میں مبتلا ہیں اور بچوں کو عرق النساء مالیخولیا اور خفقان تک ہو چکا ہے تو بقیہ خاندان کو ریزرو رکھتے ہوئے ہم نے عالمی دنوں کا وہ کیلنڈر میز کی دراز سے نکال لیا جو اقوام متحدہ کے علاقائی رابطہ دفتر کے افسر رابطہ سے رابطہ کر کے بڑی کاوشوں سے تیار کیا گیا تھا۔

کیلنڈر جیب میں ڈال کر ہم نے ایڈیٹر کے کمرے کا رخ کیا اور ان کی میز کے سامنے کرسی کھینچ کر بیٹھ گئے۔ ایڈیٹر صاحب بھی ہمیں دیکھتے ہی سنبھل گئے اور بولے۔ "کہئے آج کون بیمار ہوا ہے۔ کسے اسپتال پہنچانا ہے؟"

"جی نہیں خدا کے فضل سے گھر پر سب بخیریت ہیں۔ بلکہ اب تو قبلہ ماموں جان کی دونوں بکریاں بھی روبہ صحت ہیں۔"

ایڈیٹر صاحب کے چہرے سے کسی قدر اطمینان جھلکنے لگا۔ بولے۔ "اس کا مطلب ہے کل آپ کو چھٹی نہیں چاہئے۔"

"جی۔ خیال تو یہی تھا، لیکن کیا کریں، آج انٹرنیشنل نو اسموکنگ ڈے ہے، اس لئے....."

"مارے گئے!" انہوں نے ماتھا پیٹ لیا۔ "یہ یو این او تو ہماری جان کی دشمن ہو گئی ہے۔ اس کا

مطلب یہ ہوا کہ آج آپ کو نو اسموکنگ کے لئے چھٹی چاہئے۔ لیکن....'' اچانک ان کی آنکھیں کسی نئے خیال سے چمک اٹھیں... ''لیکن آپ تو سگریٹ نوشی عرصہ ہوا چھوڑ چکے ہیں۔ آپ کو چھٹی کی کیا ضرورت ہے ویسے بھی سگریٹ نہ پینا کسی کام کو کرنا نہیں بلکہ نہ کرنا ہے! جبکہ چھٹی کوئی کام کرنے کے لئے لی جاتی ہے کام نہ کرنے کے لئے نہیں۔''

''بات آپ کی ٹھیک ہے۔ مگر بات یہ ہے کہ سگریٹ نوشی تو واقعی ہم نے ترک کردی ہے لیکن سگریٹ نہ پینے کا عام مظاہرہ نہیں کیا ہے کل دفتر سے چھٹی لے کر ہم سب کے سامنے سگریٹ نہ پی کر یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ ہم سگریٹ نہیں پیتے۔ اس سے تحریکِ انسداد تمباکو نوشی کو تقویت ملے گی اور تمباکو نوشی پر پڑنے والی یہ ضرب ماحولیاتی توازن کو برقرار رکھنے میں مدد و معاون ثابت ہوگی جس سے عالمی اور بین الاقوامی....''

''بس بس ٹھیک ہے!'' ایڈیٹر صاحب نے گھبرا کر رخصت کی درخواست پر دستخط کردیئے۔ ظاہر ہے ہماری چھٹی کو وہ عالمی مسئلہ نہیں بننے دینا چاہتے تھے!

اس واقعہ پر میاں عبدالقدوس کا تبصرہ یہ تھا۔

''شکر ہے اقوام متحدہ کو تمہارے معاملات کا علم نہیں ہے۔ علم ہوتا تو وہ ایک دن اور شروع کر دیتی۔''

''کون سا دن؟''

''چھٹیوں کا دن!''

☆ ☆ ☆

آج بھی دنیا بھر کے وہ ادیب اور دانشور جو شیکسپیئر کو اپنا شیخ اور پیر مانتے ہیں، اس قول میں پورا یقین رکھتے ہیں اور اکثر و بیشتر موقع بے موقع اس کا حوالہ بھی دیتے رہتے ہیں۔ ہم نے بھی اس قول کو درست مان لیا تھا۔ اس امید میں کہ شاید لوگ ہمیں بھی ادیبوں اور دانشوروں کی فہرست میں شامل کرلیں۔

مگر افسوس یہ ایک بھول تھی اور اس بھول کا احساس ہمیں تب ہوا جب ہماری نظر خود اپنے نام پر گئی اور ایک روز ہمیں اپنے ایک قدردان کا خط ملا جو القاب و آداب کے بعد اس طرح شروع ہوتا تھا۔۔۔

"گستاخی معاف، میں ایسے کئی خانوں کو جانتا ہوں جو نصرت ہیں، اور کئی ایسی نصرتوں سے واقف ہوں جو بانو یا بیگم ہیں۔ آپ کیا ہیں یہ بھی بتادیجئے تاکہ قلب کو اطمینان ہو اور آپ کو باقاعدہ القاب و آداب کے ساتھ خط لکھا جاسکے۔"

خط پڑھتے ہی ہم پر ایسا لرزہ طاری ہوا کہ کچھ نہ پوچھئے۔ آنکھوں کے آگے دنیا تاریک ہوگئی اور ہم چشمہ لگا کر سوچنے لگے، یا الٰہی یہ کیا ہوگیا۔ برسوں سے تذکیر کے صیغے میں لکھتے آرہے ہیں پھر بھی قارئین کو ہماری جنس کے بارے میں شبہ ہے!

چند روز بعد ایک اور صاحب کا خط ملا انہوں نے ہمارے مضامین کی تعریف میں اگرچہ بڑی اچھی اچھی باتیں لکھی تھیں، لیکن خط کی پیشانی پر ہمارے نام سے پہلے احتیاطاً "محترم محترمہ بھی لکھ دیا۔ مجبوراً "ہمیں بھی احتیاطاً" اس خط کو تلف کردینا پڑا۔

ایک صاحب نے تو حد ہی کردی۔ سیدھے مطلب کی بات پر اتر آئے۔ انہوں نے لکھا۔۔۔

"جب سے آپ کی تحریریں قومی آواز میں چھپنا شروع ہوئی ہیں، بے قراری کا عجیب عالم ہے۔ نہ دن کو سو سکتا ہوں، نہ رات کو جاگ سکتا ہوں۔ ہر وقت بس آپ کا ہی تصور رہتا ہے۔ اگر ایک تازہ ترین تصویر عنایت فرمادیں تو بڑی عنایت ہوگی۔ نیز معلوم ہو کہ بندہ آٹے کی دو چکیوں کا مالک اور صاحب جائداد ہے اور آمدنی چار پانچ ہندسوں کے درمیان ہے۔ پہلی بیوی کو طلاق ہو چکی ہے اور اس سے کوئی بچہ بھی نہیں ہے۔ لہٰذا زیادہ کیا تحریر کروں، سمجھدار کو اشارہ کافی ہے۔ جواب سے جلد مطلع فرمائیں۔"

خط کے ساتھ موصوف کی ایک تصویر بھی تھی جس میں ان کے ایک ہاتھ پر کبوتر بیٹھا ہوا تھا اور دوسرا ہاتھ مونچھوں کو تاؤ دے رہا تھا اور مونچھوں کی ری ٹچنگ فوٹو گرافر نے بڑی محنت سے کی تھی۔

ابھی ایک ہفتہ بھی نہ گذرا تھا کہ ایک اور صاحب کا خط ہمارے ایڈیٹر کے نام آگیا جس میں ان سے دریافت کیا گیا تھا، تحت اللفظ والی صاحبہ جوان ہیں یا بوڑھی!

ایک مباحثے کی پیروڈی

انڈیا انٹرنیشنل سینٹر میں ایک آئی پی ایس ادیب کے اولین ناول ''دکان'' پر مذاکرہ ہو رہا تھا۔

آئی پی ایس ادیب کی اصطلاح پر چونکئے نہیں۔ جیسے جیسے ادیبوں میں شرح خواندگی بڑھ رہی ہے ان کا معیار بھی بلند ہوتا جا رہا ہے۔ چنانچہ جس طرح پہلے مولوی اور مولانا ادیب ہوتے تھے۔ بعد میں اسی طرح بی اے اور ایم اے ادیب پیدا ہونے لگے اور اب آئی پی ایس، آئی اے ایس اور آئی ایف ایس ادیب جنم لینے لگے ہیں۔

خیر تو ناول پر مذاکرہ اور مباحثہ ہو رہا تھا اور بے چارا اکیلا مصنف ایک درجن جغادری نقادوں کے بیچ ڈرا سہما بیٹھا تھا۔

ایک گوشے میں ویڈیو فلم بنانے والے اپنے کیمرے اور فلیش لائٹیں لئے کھڑے تھے۔ جیسے ہی کیمرہ اور لائٹیں آن ہوئیں بحث شروع ہو گئی۔

ایک نقاد نے کھنکھار کر گلا صاف کیا اور ٹائی درست کرتے ہوئے بولا۔

''ناول دکان میں فاضل مصنف نے جس طرح عصر حاضر اور عصر غیر حاضر کے نفسیاتی، اعصابی اور روحانی بحران کی عکاسی کی ہے، اس کی دوسری مثال اردو ادب تو کیا افریقی ادب میں بھی مشکل سے ملے گی۔ ناول کا مرکزی کردار اپنی پان بیڑی سگریٹ کی دکان کو ڈیمالیشن اسکواڈ سے بچانے کے لئے جس طرح ڈی ڈی اے، ایم سی ڈی اور این ڈی ایم سی والوں سے جوجھتا ہے اور پھر ویجلنس سیل اور اینٹی کرپشن ڈپارٹمنٹ والوں کی مدد سے ایک ایک کر کے ان اداروں کے بدعنوان افسروں کو رنگے ہاتھوں پکڑوا کر اخباروں میں سنگل کالمی خبریں چھپواتا ہے اسے پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ مصنف وجودیت کے

فلسفے میں گہرا یقین رکھتا ہے جو ایک قابل تحسین بات ہے!''

وجودیت کے ذکر پر دوسرے کونے میں بیٹھے ہوئے ایک نقاد کے کان کھڑے ہوئے' جو اول الذکر نقاد کے مخالف گروپ سے تعلق رکھتا تھا۔ اس نے فوراً اپنے سامنے رکھے مائک کا بٹن دبا دیا اور بولا۔

''معاف کیجئے حاضرین' مجھے اس سے سخت اختلاف ہے۔ ناول دکان میں وجودیت کے فلسفے کا نہیں بلکہ عدم وجودیت کے فلسفے کا اثر زیادہ ہے۔ کیونکہ مصنف نے دکھایا ہے کہ تمام خارجی عناصر پان بیڑی سگریٹ کی دکان کے وجود کو عدم وجود میں تبدیل کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ بلکہ ایک خارجی عناصر تو وہاں چھولے بھٹورے کی دکان کھولنا چاہتا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ.....''

یہ سنتے ہی پہلے والے نقاد کا پارہ چڑھ گیا۔ مخالف گروپ کے نقاد کی بات کاٹتے ہوئے اس نے کہا۔

''اس سے قطعی ظاہر نہیں ہوتا کہ یہ عدم وجودیت کی بات ہے۔ ناول کا مرکزی کردار جو کہ ایک یتیم اور بظاہر بے آسرا' تنہا رہنے والی قبول صورت لڑکی ہے' اپنی دکان کے وجود کو قائم رکھنے پر مصر ہے۔ لوگ کہتے ہیں عورت ذات کا بیڑی سگریٹ سے کیا تعلق؟ اس سے لڑکی کی انا کو ٹھیس پہنچتی ہے۔ وہ بپھر جاتی ہے اور خارجی عناصر کی تمام داخلی کوششوں کو ناکام بنا دیتی ہے۔ اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ.....''

''آپ غلط کہہ رہے ہیں۔ یہ انٹرپریٹیشن بالکل غلط ہے۔ لڑکی کی کوششیں داخلی نہیں خارجی ہیں.....''

''داخلی ہیں۔''

''خارجی ہیں۔''

''داخلی ہیں۔''

''خارجی ہیں۔''

''قطع کلام معاف صاحبان!'' مباحثے کے ماڈریٹر نے کہا۔ ''ایسا لگتا ہے کہ ناول دکان پر ہونے والی یہ بحث داخلی رجحانات کے وسیع دائروں میں محدود ہوتی جا رہی ہے۔ میں سمجھتا ہوں ہمیں مصنف کے طرز تحریر پر بھی گفتگو کرنی چاہئے کہ اس پر جدید اور قدیم لسانی رجحانات کا کتنا اثر ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ ہماری اس محفل میں پروفیسر بے رنگ..... معاف کیجئے پروفیسر بیرنگ بھی موجود ہیں جو لسانیات کے ایک بڑے ماہر ہیں اور حال ہی میں اردو زبان پر بحراوقیانوس کی زبانوں کے لسانیاتی عمل اور رد عمل کے بارے میں تحقیق کر کے ہونولولو سے واپس آئے ہیں لہٰذا میں پروفیسر لولو..... معاف کیجئے پروفیسر بیرنگ سے درخواست کروں گا کہ وہ مصنف کے لسانی رجحانات پر روشنی ڈالیں۔''

دعوت سخن ملتے ہی پروفیسر مذکور نے جیب سے رومال نکال کر ناک صاف کی' منہ صاف کیا'

دانت چمکائے' بالوں کو ٹھیک طرح جمایا اور کیمرے کا رخ اپنی جانب تبدیل ہونے کا انتظار کرنے لگے۔ جیسے ہی کیمرے اور لائٹوں کا رخ ان کی جانب ہوا انہوں نے کولگیٹ کے اشتہار کی طرح مسکرا کر دانت دکھائے اور بولنے کے لئے منہ کھولنے ہی والے تھے کہ دوسری طرف سے آواز آئی۔

"میں پروفیسر صاحب سے پورا اتفاق رکھتا ہوں۔"

"مگر قبلہ میں نے تو ابھی کچھ کہا ہی نہیں۔" پروفیسر صاحب نے مسکرا کر کہا۔

"کوئی بات نہیں مجھے معلوم ہے آپ کیا کہنے والے ہیں۔ گذشتہ پانچ مذاکروں سے آپ ایک ہی بات گھما پھرا کر کہہ رہے ہیں۔"

اس پر ایک زوردار قہقہہ بلند ہوا۔ وہ تھما تو ایک نقاد نے کہا۔

"صاحبان میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ یہ ناول دراصل ناول ہے ہی نہیں۔ یہ محض ایک منظر نامہ ہے۔ ناول وہ ہوتا ہے جس میں واقعات ہوں۔ جبکہ اس ناول میں جو کچھ ہے وہ ہر روز ہوتا رہتا ہے۔ اور جو ہر روز ہوتا ہے وہ واقعہ ہرگز نہیں ہو سکتا۔ پس ثابت ہوا کہ یہ ناول نہیں ہے۔"

تبھی ایک مبتدی نقاد نے کہا۔ "حضرات میری بھی سنئے۔ میں یہ کہنا چاہوں گا کہ اس ناول کا مرکزی کردار' البرٹ کاموکے آؤٹ سائڈر کے مرکزی کردار مارسال سے بہت مشابہ ہے!"

ایک مغربی ادیب کا ذکر آتے ہی محفل میں زلزلہ سا آگیا۔ سینئر نقادوں کی بھویں چڑھ گئیں۔ ان سے کم سینئر نقادوں کے کان کھڑے ہو گئے۔ ایک مہیب سی خاموشی چھاگئی۔

آخر اس خاموشی کو توڑتی ہوئی ایک آواز آئی۔

"مارسال نہیں مارسا۔"

"جی نہیں مرسال" کسی اور نے کہا۔

"نہیں صاحب مرسلاں۔" تیسرا بولا۔

"مرسلاں نہیں مرسلین کہئے۔" چوتھے نے کہا۔

"میں نے پورا ناول پڑھا ہے۔ اس کا نام مارسال ہی ہے۔" مبتدی نقاد نے کہا۔

"مجھے آپ کے دعوے پر شبہ ہے۔" ایک جغادری نقادے نے کہا۔ "مرسا عرف مارسا مشاہدہ نفس کا عادی اور داخلیت پسند کردار ہے۔ اور مصنف کا نام بھی البرٹ نہیں الیئر کاموہے۔ اس میں ٹی سائلنٹ ہے۔ اگر آپ نے کامو کو سچ مچ پڑھا ہوتا تو یہ غیر ذمہ دارانہ بیان ہرگز نہ دیتے۔ میرے خیال سے تو دکان کے مرکزی کردار پر جارج ایلیٹ کے مڈل مارچ کا زیادہ اثر ہے!"

"جارج ایلیٹ نہیں جناب ٹی ایس ایلیٹ کہئے۔" ایک نئی آواز نے سب کو چونکا دیا۔

سب کی نگاہیں آواز کی طرف مڑ گئیں۔ اس نقاد کو پہلے کسی نے نہیں دیکھا تھا۔ چند لمحے خاموش

رہ کر اس نے بات آگے بڑھائی۔ ''آپ غالباً' جارج واشنگٹن سے کنفیوز کر گئے ہیں۔ بہر کیف مجھے لگتا ہے ٹی ایس ایلیٹ کے کانفیڈ نیشیل کلرک سے ہمارا مصنف خاصا متاثر معلوم ہوتا ہے اور کہیں کہیں اس نے روسو کے کنفیشن کا اثر بھی قبول کیا ہے۔ کئی جگہوں پر اس کی توجہ کانٹ کے کرنک آف پیور ریزن کی طرف بھی گئی ہے۔ بلکہ صفحہ چار سو بیس کے تیسرے پیراگراف میں تو اس نے ٹامس ہارڈی کے مئیر آف کاسٹر برج کا ایک مشہور منظر بھی دوہرا دیا ہے۔ آپ سمجھ گئے ہوں گے میرا اشارہ کس طرف ہے؟''

سب نقادوں نے ایک دوسرے کی طرف حیرت سے دیکھتے ہوئے اثبات میں گردن ہلا دی۔ ظاہر ہے نفی میں گردن ہلانے کے خطروں سے وہ بخوبی واقف تھے۔

''یہ وہی منظر ہے دوستو۔'' نیا نقاد کہے جا رہا تھا۔ ''جو وکٹر ہیوگر کے لامزریبل میں کئی جگہ آیا ہے تاہم ایک کمی رہ گئی ہے اور وہ یہ کہ الیگزاندر دوما کے کاؤنٹ آف مونٹے کرسٹو سے لے کر ماریو پزو کے گاڈ فادر تک مغربی ادب میں قدروں اور تہذیب کے انحطاط کی جن زیریں اور بالائی سطحوں کی نشاندہی کی گئی ہے ان سے مصنف یکسرے بے گانہ معلوم ہوتا ہے۔ کیا ہی اچھا ہوتا اگر فاضل مصنف نے مولیئر کے دی مائزر اور ڈی ایچ لارنس کے سنس اینڈ لورس کے اسلوب پر بھی توجہ دی ہوتی اور فتشے سے کافکا تک شعور کی رو نے جو سفر طے کیا ہے اس پر.....''

ہم نے دیکھا محفل کے آدھے نقاد بے ہوش ہو کر لڑھک چکے تھے اور باقی لڑھک کر بے ہوش ہونے والے تھے۔

جانتے ہیں یہ نقاد کون تھا؟

جی ہاں آپ نے ٹھیک پہچانا۔

یہ تھے میاں عبدالقدوس' جنہوں نے ہمارے علم کے مطابق ابن صفی' اظہار اثر اور اکرم الہ آبادی کے علاوہ زندگی میں کسی کا ناول نہیں پڑھا تھا۔

☆ ☆ ☆

وزن اپنا اپنا

ایک دن میاں عبدالقدوس کی توجہ ہم نے ان کی صحت کی طرف دلائی۔

"ذرا اپنے وزن کی طرف بھی توجہ کیجئے خاں صاحب کافی بڑھتا جارہا ہے۔ یوں وزن کا بڑھنا صحت کے لئے ٹھیک نہیں۔"

انہوں نے چند لمحے ہمیں گھور کر دیکھا پھر لاپرواہی سے آسمان کی طرف نظر اٹھا کر بولے۔ "کافی دنوں سے یوگنڈا میں کوئی انقلاب نہیں آیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے وہاں سیاسی استحکام پیدا کردیا گیا ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے۔"

ہم سمجھ گئے' وہ بات کو ٹال رہے تھے۔

"بات کو ٹالنے کی کوشش نہ کیجئے خاں صاحب۔ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں کافی سنجیدگی سے کہہ رہا ہوں۔ آپ کا وزن بڑھ گیا ہے۔ اسے گھٹانے کی کوشش کیجئے۔" ہم نے کہا۔

"اور تو اور بہت دنوں سے کوئی جنگ بھی نہیں چھڑی ہے۔ ایران اور عراق کی جنگ بند ہونے کے بعد سے تو ایسا لگتا ہے کہ جنگوں کا قحط پڑ گیا ہے۔ بے چارے امریکہ کا کیا ہوگا؟" انہوں نے پھر بات گھمانے کی کوشش کی۔

"امریکہ کی نہیں خان صاحب اپنی صحت کی فکر کیجئے' موٹاپا صحت کا دشمن اور تمام بیماریوں کی جڑ ہے۔ اپنے وزن کی طرف دھیان دیجئے قبلہ! روز صبح اٹھ کر ورزش کیا کیجئے۔"

"اماں رہنے دو۔ بے کار کی باتیں مت کرو۔" خاں صاحب لائن پر آگئے۔ "جسے تم وزن کہہ رہے ہو' وہی صحت ہے۔ کھایا پیا تن کو لگتا ہے تبھی وزن بڑھتا ہے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے خاں صاحب، لیکن وزن ایک حد تک رہے تبھی ٹھیک ہے۔ آدمی کا وزن نہ بہت کم ہو نہ بہت زیادہ۔ شائد آپ کو یہ نہیں معلوم کہ پتلا دبلا آدمی تو پھر بھی کافی عرصہ جی لیتا ہے۔ لیکن موٹے آدمی بہت جلد دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں۔ بلکہ میں نے تو یہاں تک سنا ہے کہ موٹے آدمی کی بخشش بھی کافی دیر سے ہو گی!"

"لاحول ولا قوت نہ جانے کیا کیا اناپ شناپ دن رات سنتے رہتے ہو۔"

"چلئے چھوڑیئے بخشش والی بات جانے دیجئے، غیر مصدقہ ذرائع سے سنی تھی۔ لیکن اس بات سے آپ انکار نہیں کر سکتے کہ ورزش صحت کے لئے بہت ضروری ہے۔"

"غلط بالکل غلط! یہ ٹھیک ہے کہ ورزش اچھی چیز ہے۔ خود مجھے بھی ورزش بہت پسند ہے۔ میں اکثر لوگوں کو ورزش کرتے دیکھتا رہتا ہوں۔ لیکن ورزش سے صحت بنتی ہے یہ میں نہیں مان سکتا۔ اگر ورزش سے صحت بنتی تو ان کروڑوں غریب ہندستانیوں کی بنتی جو دن رات سڑکوں پر رکشہ کھینچتے ہیں۔ بس اڈوں اور ریلوے اسٹیشنوں پر قلی گیری کرتے ہیں۔ گوداموں میں بوجھ ڈھوتے ہیں۔ پتھر توڑتے ہیں۔ اینٹ گارا اٹھاتے ہیں۔ ٹھیلہ کھینچتے ہیں۔ ہتھوڑا چلاتے ہیں۔ اور نہ جانے کیسے کیسے ورزش والے کام کرتے ہیں۔ ان کی صحت کیوں نہیں بنتی؟ کیا رکشہ کھینچنا، وزن اٹھانا اور محنت کرنا ورزش میں نہیں آتا؟ اگر آتا ہے تو جائز کرایہ مانگنے پر رکشہ والا سواریوں سے کیوں پٹ جاتا ہے؟ ہٹے کٹے مزدور کو پتلا دبلا ٹھیکیدار ذرا سی بات پر کام سے کیسے ہٹا دیتا ہے؟"

"اوفوہ خاں صاحب، آپ بات کو کہاں سے کہاں لے گئے۔ میں تو صرف موٹاپے کی بات کر رہا تھا۔ آپ میری بات مانئے موٹاپے سے جسم پر چربی چڑھ جاتی ہے۔ خون میں کولسٹرول بڑھ جاتا ہے۔ دل کو زیادہ کام کرنا پڑتا ہے۔ جس سے دل کی بیماریاں ہو جاتی ہیں۔ بلڈ پریشر گھٹنے بڑھنے لگتا ہے۔ ذرا سی محنت کرنے پر آدمی ہانپ جاتا ہے۔ یہ سب صحت خراب ہونے کی نشانیاں ہیں۔ میں نے سنا ہے کہ آپ بھی تھوڑا سا کام کرنے پر ہانپ جاتے ہیں۔ کوئی کہہ رہا تھا کہ کل جب پنساری کی دکان سے آپ پانچ کلو گھی لے کر آئے تو بری طرح ہانپ رہے تھے؟"

"تو تم کیا سمجھتے ہو؟" انھوں نے کہا "پچاسی کلو وزن اٹھا کر آدمی ایک فرلانگ سے آئے گا تو کیا بیٹھ کر سیٹی بجائے گا؟"

"پچاسی کلو!؟ تو کیا اتنا سارا گھی اٹھا لائے تھے؟"

"نہیں۔ گھی تو خیر پانچ کلو ہی تھا۔ لیکن اسی کلو کا میرا اپنا وزن بھی تو ہے!" انھوں نے جیب سے

* یہ خلیج کی عالمی جنگ سے پہلے کی باتیں ہیں۔

پان مسالے کی ڈبیا نکالتے ہوئے کہا۔

اس گفتگو کے ایک ہفتہ بعد کی بات ہے۔ ایک دن میاں عبدالقدوس نے ہمیں صبح سویرے آکر جگا دیا۔ بولے۔

"اٹھو بھئی دن چڑھ آیا ہے' چھ بج چکے ہیں' کب تک احدیوں کی طرح سوتے رہو گے۔"

"خیریت تو ہے خاں صاحب؟" ہم نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھول لیں۔ "آج کیا سورج مغرب سے نکل آیا ہے؟"

"نہیں بھئی سورج تو روز کی طرح جمنا پار سے ہی نکلا ہے' البتہ میں گھر سے ذرا جلدی نکل آیا ہوں!"

"جلدی؟ چھ بجے کو آپ جلدی کہتے ہیں خاں صاحب۔" ہم نے احتجاج کیا یہ تو بقول مجاز لکھنوی کووں کے جاگنے کا وقت ہے۔ بلکہ میرے خیال سے تو بہت سے کوے بھی ابھی تک سو رہے ہوں گے!"

"لاحول ولا قوت! کووں کو کیا تم نے آدمی سمجھ رکھا ہے جو دن چڑھے تک بستر پر لیٹے خراٹے لیتے رہیں گے۔ تم ہی کہتے تھے وزن بڑھ رہا ہے لہٰذا یہ احدی پن چھوڑو اور صبح ذرا جلدی اٹھا کرو۔ آدمی کو احدی کی طرح نہیں قیدی کی طرح سونا چاہئے۔"

"قیدی؟"

"ہاں۔ جیل میں قیدیوں کو سورج نکلنے سے پہلے جگا دیا جاتا ہے۔ پنجاب جیل مینوئل سن سولہ سو اڑتالیس کے مطابق ایسا کرنا ضروری ہے۔"

"چلئے مان لیا۔ مگر خدا کے لئے گھروں میں تو جیل کا مینوئل لاگو نہ کیجئے۔ خیر اب بتائیے۔ آخر کون سا پہاڑ ٹوٹ پڑا جو آپ نے ہمیں آدھی رات کو جگا دیا ہے!"

"یار تم آدمی ہو یا ندا فاضلی؟ کھڑکی کے پردے کھینچ کر سمجھتے ہو کہ رات ہو گئی!" انہوں نے کمرے کی تمام کھڑکیوں کے پردے ہٹاتے ہوئے کہا۔ "لو ذرا اب دیکھو' کیا سہانی دھوپ نکلی ہوئی ہے۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا بہہ رہی ہے۔ نسیم صبح کے جھونکے سبز پیڑوں کی شاخوں میں سرگوشیاں کر رہے ہیں آم کے درختوں میں کوئل میٹھے راگ گا رہی ہے' چرند اور پرند چہچہا رہے ہیں' باغوں میں جھولے پڑے ہیں'

آسمان پر کالے سفید بادل چھائے ہوئے ہیں' زمین انگڑائی لے رہی ہے۔ وغیرہ وغیرہ! ذرا باہر نکل کر قدرت کے ان نظاروں کا لطف تو اٹھا کر دیکھو!''

''یہ آپ کہاں کا منظر بیان کر رہے ہیں۔ خاں صاحب؟'' ہم نے پوچھا۔

''چڑیا گھر کا!'' انہوں نے برا سا منھ بنا کر کہا۔ ''تم کیا سمجھتے ہو؟ کیا جمنا پار میں کوئی ایسی جگہ ہے جہاں ٹھنڈی ہوا اور آم کے درخت ہوں اور کوئل صبح کو راگ وغیرہ گاتی پھرتی ہو۔''

''تو پھر یہ سب کچھ کہاں دیکھ لیا آپ نے؟''

''دیکھا نہیں بھائی' پڑھا ہے۔ کل ہی رام پور شریف سے میرے بھتیجے کی ممانی کی خالہ کی نواسی کا خط آیا ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ رام پور منہاران میں آج کل ایسا ہی موسم ہے!''

''الٰہی خیر' تو کیا یہ منظر دیکھنے کے لئے اب ہمیں آپ کے ساتھ رام پور منہاران چلنا ہوگا اور وہ بھی صبح صبح!''

''لعنت ہے! تم سنتے تو ہو' نہیں اپنی ہانکے جاتے ہو۔ ارے بھائی صبح کا وقت ہے ایسے میں آدمی کو باہر نکل کر چہل قدمی کرنی چاہئے۔ صبح کی سیر سے صحت اچھی رہتی ہے اور وزن گھٹتا ہے۔ سحر خیزی کی تعریف تو جوش ملیح آبادی جیسے رند خرابات نے بھی کی ہے۔ اس لئے میں نے آج سے سحر خیزی کو معمول بنانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ جانتے ہو' صبح صبح سیر کرنے سے پھیپھڑوں کو تازہ ہوا ملتی ہے' جس سے خون صاف ہو جاتا ہے۔ رگ پٹھوں کی ورزش ہوتی ہے' جسم سڈول بنا رہتا ہے چہرے پر نور آجاتا ہے اور...''

اور ہم ان کی تقریر سے ایسے متاثر ہوئے کہ اسی وقت سیر کے لئے نکل پڑے اور فیصلہ کر لیا کہ روز سیر کو جایا کریں گے۔ آخر جب دن کے بارہ بجے سو کر اٹھنے والے خاں صاحب صبح ۶ بجے سیر کے لئے اٹھ سکتے ہیں تو ہم کیوں نہیں اٹھ سکتے؟

اس روز جب ہم سیر سے واپس آئے تو طبیعت میں ایک عجیب شگفتگی محسوس ہوئی' دل و دماغ پر ایک سرور سا چھا گیا اور بستر پر بیٹھتے ہی نیند آگئی۔ اس کے بعد ہم نے صبح کی سیر کو روز کا معمول بنا لیا۔ مگر افسوس' یہ سلسلہ زیادہ دن نہ چل سکا۔ اگلے روز خاں صاحب سات بجے سو کر اٹھے' تیسرے دن انہوں نے ساڑھے سات بجا دیئے۔ چوتھے دن طے پایا کہ اب سے ہم انہیں جگایا کریں گے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پانچویں دن ہم ساڑھے آٹھ بجے سیر کو نکلے۔ خاں صاحب نے جھنجھلا کر جگانے کا کام پھر اپنے ذمے لے لیا اور چھٹے روز ہمیں ٹھیک ۹ بجے جگا دیا۔

آخر ساتویں روز جب وہ اور ہم ایک ساتھ صبح گیارہ بجے ایک دوسرے کو جگانے کے لئے نکلے تو

ہم سے نہ رہا گیا۔

"معاف کیجئے خاں صاحب یہ روگ ہم لوگوں کے بس کا نہیں۔"

"ہاں تم ٹھیک کہتے ہو۔" انہوں نے سرد آہ بھر کر کہا۔ مگر اچانک کسی نئے خیال سے ان کی آنکھیں چمک اٹھیں اور بولے۔

"یار ایک بات تو بتاؤ صبح صبح پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے؟ کیوں نہ ہم لوگ شام ہی کو صبح کی سیر کر کے سو جایا کریں!"

اسی وقت قریب کے ایک درخت سے کسی پرندے کی آواز آئی اور ہم بس آنکھیں جھپکا کر رہ گئے۔

☆ ☆ ☆

بچے رنگ

نوٹ:۔ اٹھارہ سال سے زیادہ عمر کے نابالغ حضرات یہ مضمون نہ پڑھیں۔ عاقبت خراب ہونے کا اندیشہ ہے۔ اطلاعاً پیشگی عرض ہے کہ یہ تحریر بچوں کے لئے ہے۔ بعد میں نہ کہئے کہ ہمیں بتایا نہیں تھا!

ہاں تو پیارے بچو! آج ہم تمہارے ممی ڈیڈی کے بجائے خود تم سے مخاطب ہیں۔ جانتے ہو کس لئے؟ اس لئے کہ اس وقت سب کی نگاہیں تم پر ہی لگی ہوئی ہیں۔

بچو، شاید تمہیں نہیں معلوم کہ تم اس ملک کا مستقبل ہو، اس قوم کی تقدیر اور آنے والا کل ہو۔ اس حساب سے تمہارے ممی ڈیڈی ملک کا آج اور نانا دادا ملک کا گذرا ہوا کل اور پرسوں ہیں۔ اگر واقعی تمہیں یہ بات معلوم نہیں تو گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔

جب ہم اس ملک کا آنے والا کل تھے تو خود ہمیں بھی یہ بات معلوم نہیں تھی۔ حالانکہ ان دنوں بھی جب چھبیس جنوری، پندرہ اگست، دو اکتوبر یا ۱۴ نومبر کی چھٹی ہوتی تھی تو ہیڈ ماسٹر صاحب اپنی تقریر میں بار بار یہی بات دوہراتے تھے کہ بچے اس دیش کا بھوشیہ ہیں، کل کے نرماتا ہیں، بچے ہی دیش کو آگے لے جائیں گے وغیرہ وغیرہ۔ بلکہ ایک مرتبہ تو انہوں نے جوش میں آکر یہ بھی کہہ دیا کہ بچو تمہیں ہی کل اس دیش کا راشٹرپتی اور پردھان منتری بننا ہے، تم ہی اس دیش کا کل ہو!

لیکن ہم یہی ضد پکڑے رہے کہ، نہیں جی ہم تو اس دیش کا آج ہیں۔ کل کی بات کون جانتا ہے؟ ہم تو آج ہی آئس کریم کھائیں گے! ماسٹر صاحب نے ڈنڈے سے سمجھانے کی کوشش کی۔ کئی مرتبہ کان پکڑی بھی ہوئی۔ بلکہ ایک دو دفعہ تو کچے رنگ کی آئس کریم کھاتے ہوئے رنگے ہاتھوں بھی پکڑے گئے۔

آخر جب ایک روز ماسٹر صاحب نے موٹے شیشے کی عینک لگا کر گھورا اور ڈنڈا ہلا کر دھمکایا تو ہم

اس خط نے ہمیں صورت حال کی سنگین نوعیت کا احساس دلا دیا اور ہم سنجیدگی سے کوئی ٹھوس کارروائی کرنے کے بارے میں سوچنے لگے۔ پہلے تو ہم نے سوچا کہ اپنے آئندہ مضمون میں اعلان کردیں کہ ہم مرد ہیں۔ مگر پھر یہ خیال گزرا کہ کہیں لوگ اسے ہمارا تکبر نہ سمجھ لیں۔ پھر سوچا کہ جن حضرات کے خطوط اب تک ملے ہیں ان سب کو بذریعہ خط اطلاع دے دیں کہ ہم مرد ہیں۔ لیکن اس میں بھی ایک قباحت تھی۔ ایسا نہ ہو کہ خط لکھنے والوں میں سے کوئی پہلوانی کا شوق رکھتا ہو اور وہ ہماری اطلاع کو کشتی کا چیلنج تصور کرلے۔ سوچتے سوچتے ایک اور تدبیر سوجھی، کیوں نہ مضمون کے ساتھ اپنی تصویر بھی چھپوا دیں۔ تصویر دیکھیں گے تو لوگوں کی غلط فہمی خود بخود دور ہو جائے گی۔ ہم نے فوراً جیب سے اپنا جیبی سائز فوٹو نکالا اور ایڈیٹر صاحب کے کمرے میں پہنچ کر انہیں اپنی تجویز سے آگاہ کردیا۔

ایڈیٹر صاحب نے پہلے فوٹو کو پھر ہمیں بغور اوپر سے نیچے تک دیکھا اور بولے---

"اول تو ہم نیگیٹو نہیں چھاپتے۔ پھر تم مونچھیں بھی نہیں رکھتے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تصویر چھپنے کے بعد یہ غلط فہمی کوئی تیسرا رخ اختیار کرلے۔ تمہارا تو خیر کچھ نہیں۔ البتہ اخبار پر حرف آجائے گا۔"

اور ہم منہ لٹکائے ان کے کمرے سے باہر آگئے۔

بعدہٗ یہ خواہش اور ضرورت ہم نے اپنی پہلی کتاب پر پورے صفحہ کی تصویر چھاپ کر پوری کی اور اب احتیاطاً" اس کتاب میں بھی چھاپے دے رہے ہیں۔

امید ہے آپ سب خیریت سے ہوں گے۔

یکم نومبر ۱۹۹۶ء

نصرت ظہیر
کھچڑی پور کالونی
دہلی-۹۱

نے آئس کریم پھینک کر ہتھیار ڈال دیئے اور گھبرا کر ماسٹر صاحب کی تمام باتوں سے اتفاق کر لیا۔

اس کے بعد جب ہم نے گھر جا کر سب کو یہ خوش خبری سنائی کہ ہم آج سے اس ملک کے ہونے والے پردھان منتری بن گئے ہیں اور ملک اور قوم کا سارا مستقبل اب ہم نے اپنے ہاتھوں میں لے لیا ہے تو والد صاحب نہ صرف مرعوب ہو گئے بلکہ گھبرا بھی گئے۔ اس کے بعد والدہ نے ہماری نظر اتروائی اور والد صاحب نے نماز پڑھ کر دم کیا۔ تب کہیں جا کر دونوں کا خوف دور ہوا اور ہم آرام سے اس وقت کے کل اور آج کے آج میں پہنچ گئے۔

پچھلے دنوں ہم نے کئی بڑے افسروں کو جا کر بتایا کہ بھئی اس ملک کا مستقبل ہیڈ ماسٹر ثناء اللہ خاں مرحوم ہمارے ہاتھوں میں سونپ گئے تھے۔ لہٰذا کچھ فیصلے ہمیں بھی کر لینے دو۔ مگر انہوں نے ہمیں سیکیورٹی گارڈ کی رہنمائی میں بس اسٹاپ پر واپس بھیج دیا اور کہا کہ کل آ کر بات کیجئے گا!

تب سے ہم یہی سوچ رہے ہیں کہ کل کب آئے گا؟ ہیڈ ماسٹر صاحب آخر کس کل کی بات کیا کرتے تھے؟

تو پیارے بچو، اگر تمہیں یہ معلوم نہیں ہے کہ تم اس دیش کا کل ہو تو کوئی بات نہیں۔ خود ہمیں آج تک معلوم نہیں ہوا ہے کہ ہم اس دیش کا کیا ہیں؟

جانتے ہو بچو، اس حکایت سے ہمیں کیا سبق ملتا ہے؟

اگر نہیں جانتے تو کوئی بات نہیں۔ ہم بتاتے ہیں۔ اس سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ کچے رنگوں کی آئس کریم کبھی نہیں کھانی چاہئے!

☆ ☆ ☆

تعلیم بالغاں

پبلک اسکول، پبلک کے ذریعے چلنے والے پبلک کے وہ اسکول ہوتے ہیں جو پبلک کے لئے۔ نہیں ہوتے۔ یہ خاص اسکول ہوتے ہیں جو خاص پبلک کے لئے خاص طور پر کھولے جاتے ہیں۔ عام پبلک یعنی ہما شما کے لئے عام اسکول ہوتے ہیں جو میونسپل کارپوریشن کھولتی ہے۔ (ہما شما سے وہ لوگ مراد ہیں جن کی ذہنی نشوونما ہما اور شما جیسے رسائل سے ہوتی ہے)

بنیادی فرق ہر دو اسکول میں یہ ہوتا ہے کہ پبلک اسکول میں تعلیم پر کم اور تعلیم دینے کے جدید طریقوں پر زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ جبکہ کارپوریشن کے اسکولوں میں دونوں میں سے کسی چیز پر زور نہیں دیا جاتا۔

ایک بنیادی فرق یہ بھی ہے کہ پبلک اسکولوں میں بچوں کی فیس زیادہ اور ٹیچر کی تنخواہ کم ہوتی ہے۔ جبکہ میونسپل اسکول میں بچوں کی فیس بہت کم اور ٹیچروں کی تنخواہیں زیادہ ہوتی ہیں۔ اتنی زیادہ کہ بے چارے بڑی مشکل سے خرچ کر پاتے ہیں۔ اور کبھی کبھی تو ایک مہینے کی تنخواہ خرچ نہیں ہو پاتی کہ دوسرا مہینہ آجاتا ہے۔

کچھ اور چھوٹے موٹے فرق بھی ہیں۔ مثلاً ایک فرق یہ ہے کہ پبلک اسکول کے بچے اسکول کی بس یا اپنی کار میں آتے جاتے ہیں۔ جبکہ میونسپل اسکول میں بلا تفریق مذہب وملت، ہر بچے کو پیدل آنے کی اجازت اور سہولت رہتی ہے۔ چاہے اس کا گھر اسکول سے کتنا ہی دور کیوں نہ ہو!

ایک اور فرق یہ ہے کہ پبلک اسکولوں میں پڑھائی کے مقابلے میں کلچرل پروگرام زیادہ ہوتے ہیں۔ جبکہ میونسپل اسکولوں میں بچوں کو ذرا بھی تنگ نہیں کیا جاتا۔ نہ ان پر پڑھائی بوجھ ڈالا جاتا ہے نہ کلچر

کا۔ ہاں کلچرل پروگرام کے نام پر مہینہ میں ایک مرتبہ (کہیں کہیں سال میں ایک مرتبہ) بچوں کو ہر طرح کے پروٹین سے پاک خالص سپرٹا دودھ ضرور تقسیم کردیا جاتا ہے۔ باقی کلچر بچے گلی محلے میں خود ہی ڈھونڈ لیتے ہیں۔

لیکن ان اسکولوں کا فرق سب سے زیادہ اسی وقت نمایاں ہوتا ہے جب آپ اپنے نونہال کو ان میں داخلہ کے لئے لے جاتے ہیں۔

پبلک اسکول میں داخلہ کے وقت بچے کی قابلیت کا ٹیسٹ لیا جاتا ہے۔ اس کے لئے اسکول والے اچھی طرح ٹھوک بجا کر دیکھتے ہیں کہ والدین اسکول کی فیس ادا کرنے کے قابل ہیں یا نہیں۔ پھر جب والدین اسکول کی ٹیوشن فیس، کنوینس فیس، بریک فاسٹ فیس، ٹیچرز ویلفیئر فیس، اور کلچر فیس کے علاوہ مستقل طور پر نافذ کی جانے والی ہر ہنگامی فیس بھرنے کی حامی بھر لیتے ہیں تب ان کی اہلیت کا سب سے مشکل امتحان ہوتا ہے۔ ان سے اسکول کی امداد کے لئے عطیہ طلب کیا جاتا ہے۔

جو والدین اس عطیہ بالجبر کو بالصبر ادا کر کے امتحان میں پاس ہو جاتے ہیں ان کے بچے کو فوری طور پر اسکول یونیفارم فیس ادا کرنے کی اجازت دے دی جاتی ہے۔

اس کے برعکس جب آپ میونسپل اسکول میں داخلہ کے لئے جاتے ہیں اور ہیڈ ماسٹر اپنی عینک نیچے سرکا کر آپ کو اوپر سے نیچے تک دیکھنے کے بعد ایک خستہ حال اسٹول پر بیٹھنے کی اجازت دیتا ہے تو نہ بچے کی قابلیت پوچھی جاتی نہ آپ کی اہلیت کے بارے میں کوئی سوال ہوتا ہے۔ صرف بچے کے پیدا ہونے کا ثبوت مانگا جاتا ہے۔ جیسے ہی آپ حلفیہ بیان یا برتھ سرٹیفکٹ دے کر یہ ثابت کردیتے ہیں کہ آپ کا بچہ بلاوجہ نیکر پہنے نہیں کھڑا ہے بلکہ سچ مچ پیدا ہو چکا ہے تو اسے اس کی عمر کے مطابق کلاس میں داخلہ دے دیا جاتا ہے۔

اس کے بعد آپ مطمئن ہو جائیے۔ جس طرح مچھلی کا بچہ پانی میں جاتے ہی اپنے آپ تیرنے لگتا ہے۔ اسی طرح آپ کے بچے کی ذہنی نشوونما بھی میونسپل اسکول میں جاتے ہی شروع ہو جائے گی۔

سہ ماہی امتحان تک وہ کنچے کھیلنا سیکھ جائے گا۔ شش ماہی تک پتنگ اڑانے لگے گا اور سالانہ امتحان آنے تک وہ تمام غیر نصابی محاوروں اور کہاوتوں کے استعمال میں طاق ہو جائے گا۔ آپ یہ دیکھ کر حیران رہ جائیں گے کہ ذرا سی عمر میں وہ رشتوں کی نزاکت سے کس حد تک واقف ہو چکا ہے۔ اور دوسرے بچوں کے ماں باپ اور بھائی بہنوں سے بالغانہ تعلقات قائم کرنے کا کس درجہ مشتاق رہتا ہے!

کم سن بچوں کے لئے تعلیم بالغاں کی یہ سہولت آپ کو پبلک اسکول میں مشکل سے ہی ملے گی۔ وہاں آپ کا بچہ اسکول سے فارغ ہو کر کالج پہنچ جائے گا تب بھی آپ کو ایسا لگے گا جیسے وہ ذہنی طور پر اب بھی بچہ ہے۔ یہاں تک کہ آپ کا جی چاہے گا اسے دوبارہ نرسری میں داخل کرادیں۔ شاید اسی طرح بر

وقت بالغ ہو جائے۔

لیکن اس تدبیر کے بعد بھی جب وہ بڑا ہو گا اور ایک کانونٹ میں پڑھی لکھی لڑکی لے کر بھاگ جانے کے باوجود اسکی ذہنی سطح آپ کو سرسری طور سے دیکھنے پر نرسری دور میں ہی پڑی نظر آئے گی تو آپ بے اختیار کہہ اٹھیں گے۔

غم ہستی سے بس بیگانہ ہوتا
خدایا کاش میں دیوانہ ہوتا
مرے گھر کاش یہ پیدا نہ ہوتا!

پس ثابت ہوا کہ اگر آپ اپنے بچے کو فوراً بالغ کرانا چاہتے ہیں تو اسے میونسپل اسکول میں داخلہ دلانے سے بہتر کوئی تدبیر نہیں، اور اگر اسے ہمیشہ "بوبو" بنائے رکھنا مقصود ہے تو پبلک اسکول اور کانونٹ سے اچھی جگہ کوئی نہیں!

☆ ☆ ☆

تیسرا کان

وہ جامع مسجد کے قریب سے گذر رہا تھا۔ اچانک پیچھے سے ایک کڑک دار آواز آئی۔

"پلٹ تیرا دھیان کدھر ہے۔"

اس نے مڑ کر دیکھا۔ میلے کچیلے کپڑوں میں لمبی کالی داڑھی اور گہری سانولی رنگت والا ایک فقیر اسے اشارے سے اپنے پاس بلا رہا تھا۔

"کیا مجھ سے کوئی کام ہے بابا؟" اس نے فقیر کے پاس جا کر پوچھا۔

"ہاں!" فقیر نے کہا۔ "دس روپے نکال' بہت زور کی طلب لگی ہے۔"

فقیر کی صاف گوئی پر اسے دل ہی دل میں ہنسی آگئی اور اس نے مسکراتے ہوئے جیب سے دس کا نوٹ نکال کر اس کی ہتھیلی پر رکھ دیا' ظاہر ہے فقیر اسمیک کا عادی تھا۔

فقیر نے گول گول آنکھیں گھما کر پہلے دس کے نوٹ کو اور پھر اسے دیکھا اور بولا "ارے۔ تو تو بڑا دلاور ہے۔ بول کیا مانگتا ہے؟"

"کچھ نہیں بابا!" اس نے کہا۔ "من کی شانتی اور سچ کا گیان۔ اس کے بعد اب مجھے کچھ نہیں چاہئے؟"

"کیا کہا؟۔ سچ کا گیان؟" فقیر کڑک کر بولا۔ "کیا تجھے سچ کا گیان ہو چکا ہے؟"

"ہاں بابا! کچھ کچھ!" اس نے کہا۔ "مجھے سچ کا گیان ہو گیا ہے۔ من سچا تو سب جگ سچا! بزرگوں نے کہا ہے یہی سچ ہے۔ اسی سے شانتی ملتی ہے۔"

"ہنہ!" فقیر اس کا مذاق اڑانے لگا۔ "تو بھی مورکھ ہے۔ یہ سچ نہیں ہے۔ لے' یہ لے۔ اس

سے تجھے سچ کا گیان ہو گا!''

فقیر نے اپنے جھولے سے ائر فون جیسا ایک بٹن نکال کر اسے دیا اور بولا۔ ''اسے کان میں لگا لے یہ طلسمی کان ہے۔ جب تک اسے لگائے رکھے گا دوسروں کے من کی بات سنتا رہے گا۔''

''اس نے فقیر کو سلام کیا اور سودا سلف خریدنے کے بعد گھر پہنچ گیا۔ دروازے میں داخل ہوتے ہی وہ اچانک رکا اور کچھ سوچ کر فقیر کا دیا ہوا بٹن کان میں لگا لیا۔

بیوی اس کا انتظار کر رہی تھی۔ اسے دیکھتے ہی وہ مسکراتی ہوئی آئی اور اس کے ہاتھ سے سامان لینے لگی۔

''اوفوہ۔ اتنا سارا سامان خود ہی کیوں اٹھائے چلے آرہے ہیں۔ رکشہ والے سے کہہ دیتے یا میں اٹھالاتی۔ ڈاکٹر نے منع کیا ہے آپ کو زیادہ محنت کرنے سے۔ اپنی صحت کا کچھ تو خیال رکھا کیجئے۔'' بیوی محبت سے بولی۔

اس کا دل خوشی سے بھر گیا۔ بیوی کی محبت بھری شکائت کے جواب میں وہ کچھ کہنے ہی والا تھا کہ اچانک کانوں میں آواز آئی!

''توبہ کس قدر بھلکڑ آدمی ہے۔ لگتا ہے صراف کے یہاں سے آج بھی میرا نیکلس لے کر نہیں آیا ہے۔ یہ شخص تو مجھے پاگل کردے گا۔''

اپنی بیوی کی آواز سن کر وہ سکتے میں آگیا۔ ہاں! یہ واقعی اس کی بیوی کی آواز تھی جو اپنے ہونٹوں کی مسکراہٹ اور آنکھوں کی چمک میں دنیا بھر کا پیار سمیٹے اس کے سامنے کھڑی تھی!

''میں صراف کے یہاں گیا تھا۔ اس نے کہا ہے کہ شام تک مرمت ہو جائے گی۔ کل صبح جا کر لے آؤں گا۔''

''کوئی بات نہیں۔ کوئی بات نہیں! میں تو یہ کہہ رہی تھی کہ بلڈ پریشر اب ٹھیک نہیں رہتا۔ اس لئے وزن مت اٹھایا کیجئے۔'' بیوی نے کہا۔

مگر اسے کچھ اور سنائی دے رہا تھا۔ بیوی کہہ رہی تھی۔ ''ہائے دیکھو تو کمبخت کو' کتنی جلدی تاڑ گیا کہ میں نیکلس کے بارے میں ہی سوچ رہی ہوں گی' اس لئے کیسی باتیں بنا رہا ہے۔ جب کہ میں جانتی ہوں یہ کاہل انسان وہاں گیا ہی نہیں ہو گا۔''

''میں باتیں نہیں بنا رہا ہوں۔'' وہ ہانپنے لگا۔ ''سچ مچ گیا تھا صراف کی دکان پر۔''

''مگر میں اس کی بات کہاں کر رہی ہوں۔ مجھے تو آپ کے بلڈ پریشر کی فکر ہو رہی تھی۔ اگر آپ کو میرا کہنا برا لگا ہو تو معافی چاہتی ہوں۔ خدا کے لئے مجھے معاف کر دیجئے۔ مگر اس طرح نہ پیش آیئے۔'' بیوی کی آنکھوں میں آنسو جھلکنے لگے۔

آنسو دیکھ کر اس کا دل تڑپ اٹھا۔ مگر تبھی اس نے سنا۔ وہ کہہ رہی تھی۔ ”حد ہوگئی ایک تو اس کمبخت کے بھلے کی کہہ رہی ہوں اوپر سے یہ طنزیہ باتیں کررہا ہے۔ ناس پیٹا مرتا بھی تو نہیں۔ پتہ نہیں اس نے وصیت بھی لکھی ہے یا نہیں۔ مکان بھی نہ جانے کس کے نام کرکے جائے گا۔ نام کیا کرے گا سارے کاغذات اپنی چڑیل ماں کو دے جائے گا اور کیا!“

”چپ ہوجاؤ۔“ وہ چیخ اٹھا۔ ”میرے بارے میں تم ایسے خیالات رکھتی ہو؟ میں نے تمہارے لئے کیا کچھ نہیں کیا۔ تمہیں کسی چیز کی کمی نہیں ہونے دی۔ تمہاری ہر خواہش کو تمہارے مطالبے سے پہلے ہی پورا کردیا۔ پھر بھی تم مجھے۔ مجھے۔ مجھے.....“

اچانک اس کے دل میں زور کا درد اٹھا اور وہ سینے کو ہاتھوں سے تھام کر گر پڑا۔ بیوی کے حلق سے ایک زور کی چیخ نکلی اور باہر گلی میں ایک قہقہہ گونجنے لگا۔

یہ وہی فقیر تھا!

☆ ☆ ☆

چینی مصری اور شکر

چینی آج کل کتنی مہنگی ہو گئی ہے یہ تو آپ حضرات جانتے ہی ہیں۔ میں نے میاں عبدالقدوس کو ایک دن چھیڑا۔

"چینی کے دام بڑھنے پر کیا تبصرہ ہے خاں صاحب آپ کا؟"

حیرت سے میری طرف دیکھ کر بولے۔ "چینی؟ کیا مطلب؟"

میں نے کہا' "کمال ہے۔ آپ چینی کا مطلب بھی نہیں جانتے۔ ارے صاحب چینی سے میری مراد ہے چینی یعنی مصری۔"

"مصری؟ وہ کیا ہوتا ہے؟"

"ہوتا نہیں خاں صاحب ہوتی ہے۔ صنف نازک سے لے کر گلاب جامن اور برفی تک تمام میٹھی اور لطیف چیزیں مونث ہوتی ہیں۔"

"گنے' شیرے اور سوہن حلوے کو چھوڑ کر۔" انہوں نے لقمہ دیا۔

"چلئے چھوڑ دیا۔ اب بتائیے مصری یعنی چینی کے دام بڑھنے پر کیا رائے ہے آپ کی۔"

"یار تم سیدھے سیدھے شکر کیوں نہیں کہتے؟ غیر ملکی نام کیوں دیتے ہوں اسے؟"

"آپ کو معلوم ہونا چاہئے خاں صاحب کہ زمانہ قدیم میں چین اور مصر کی شکر چونکہ بہت عمدہ ہوتی تھی' اس لئے ہندستان میں اس کا نام ان ملکوں کے نام پر چینی اور مصری پڑ گیا۔ چنانچہ آج بھی عوام الناس اسے ان ہی ناموں سے پکارتے ہیں۔"

"بس بس رہنے دو' زیادہ قابلیت مت جھاڑو۔ تم جیسے عوام الناس کے اسی خناس نے زبان کا ستیاناس کیا ہے۔ شکر ہے کہ چین اور مصر والے اردو نہیں جانتے۔ اگر جانتے ہوتے تو دونوں سے اب

تک ہماری کئی جنگیں ہو چکی ہوتیں۔''

''جنگیں؟ یا خدا' وہ کیسے؟'' میں حیران تھا۔

''ذرا چین کے کسی آدمی سے جا کر یہ کہو کہ ہم چینی کو گھول کر پی جاتے ہیں۔ پھر دیکھو وہ تمہاری کیا حالت کرتا ہے۔ اور اگر خدانخواستہ کسی مصر والے سے تم نے یہ کہہ دیا کہ تم مصری کو الائچی اور سونف کے ساتھ منہ میں رکھ کر چبا جاتے ہو تو میں شرطیہ کہتا ہوں' وہ تمہارا سر توڑ دے گا! جبکہ تم چینی کو اور مصری کو صرف شکر کہو گے تو شکر پور والے بھی برا نہیں مانیں گے۔ بلکہ ہو سکتا ہے راشن کارڈ لے کر تمہارے پیچھے بھی پڑ جائیں کہ بھائی صاحب دو چار کلو ہمیں بھی دلوا دو۔ اگلے چناؤ میں آپ کو ہی ووٹ دیں گے۔''

خاں صاحب کے انداز بیان پر مجھے ہنسی آ گئی۔ لیکن ظاہر ہے ابھی انہوں نے میرے اصل سوال کا جواب نہیں دیا تھا۔

''چلئے اس بحث کو چھوڑیئے۔ یہ بتایئے کہ شکر کے بحران کا ملک پر کیا اثر پڑے گا؟'' میں نے پوچھا۔

میاں عبدالقدوس نے چند لمحے غور کیا' پھر بولے۔ ''بڑا صحت مند اثر پڑے گا۔ قوم کی صحت اچھی ہو جائے گی۔ خاص طور سے شکر کے مریضوں کو بے حد فائدہ ہو گا۔ نہ ہو گی شکر نہ رہے گی بیماری۔ میرا خیال ہے اگر شکر کے دام اسی طرح بڑھتے رہے تو ڈائبٹیز کے اسپیشلسٹ ایک دن فاقہ کشی پر مجبور ہو جائیں گے۔ جس کے نتیجے میں ان کی بھی صحت ٹھیک ہو جائے گی۔''

''یہ تو ہوا طبی پہلو۔ اب ذرا سوشل پہلو کی طرف آیئے۔'' میں نے کہا۔

''سوشل پہلو سے اگر تمہارا اشارہ اس طرف ہے کہ لوگ شکر نہ ملنے پر حکومت سے ناراض ہو جائیں گے تو تمہارا خیال غلط ہے۔ ہم ہندستانی شکر خورے ضرور ہیں لیکن ہر طرح کے حالات میں صبر و شکر سے رہنا ہماری فطرت ہے۔ ایسی صابر و شاکر اور متشکر مزاج قوم تمہیں دنیا میں کہیں نہیں ملے گی جو ہر مصیبت میں شکر خنداں رہے اور ہر آفت کے گزرنے پر شکرانہ بجالائے۔ لہٰذا اگر تم یہ سوچتے ہو کہ شکر مہنگی ہونے سے کسی قسم کی شکر رنجی پیدا ہو گی تو تم غلطی پر ہو۔ اور بالفرض محال چھ روپے کلو والی شکر بارہ روپے کلو ملنے سے کچھ لوگوں کو تکلیف ہوئی تو کل جب حکومت حرکت میں آئے گی اور مل مالکوں کو بڑھے ہوئے چھ روپیوں میں سے تین روپے گھٹانے پر مجبور کر دے گی تو حکومت مشکور ہو گی اور یہ لوگ اس کے متشکر!۔ کیا سمجھے؟''

''جی ہاں آپ ٹھیک کہتے ہیں۔'' میں نے جھنجھناتے ہوئے سر کو سہلاتے ہوئے کہا۔

☆ ☆ ☆

لمبا رام

پیارے لمبا رام۔

مشکل یہ ہے کہ اردو رسم الخط تمہارے نام کے ساتھ پورا انصاف نہیں کر سکتا۔ تمہارا نام جتنا سیدھا اور سادہ ہے اردو رسم الخط اتنا ہی ٹیڑھا اور پیچیدہ ہے۔ اس پر مشکل یہ کہ اردو سے بھی ٹیڑھے اور پیچیدہ ہیں اردو والے، جو لکھتے پڑھتے وقت زیر و زبر کا قطعی خیال نہیں رکھتے اور رہتے ان خیالوں میں ہیں کہ دنیا کو زیر و زبر کر دیں۔ اسی لئے الٹا پیش بن کر رہ گئے ہیں۔ چنانچہ کوئی تعجب نہیں لمبا رام کہ اردو میں تمہارا نام پڑھ کر اردو والے تمہارے قد کے بارے میں کوئی رائے قائم کرنے لگیں کہ نام اور قد ہی ان کی سب سے بڑی کمزوری ہے۔

تم سے کیا چھپانا۔ ہم خود بھی تمہارا نام لام پر زبر رکھ کر پڑھ گئے تھے۔ ویسے بھی اپنے یہاں رام سنگھ اور خان کے پہلے جو چاہے لگا دو، سب چل جاتا ہے۔ چنانچہ نقلی رام، شیطان سنگھ اور وحشت خاں کو بھی ہم اطمینان سے قبول کر لیتے ہیں۔ تمہارا نام تو پھر بھی خاصا بے ضرر ہے۔

چند ماہ پہلے جب تمہارا نام پہلی بار اخباروں میں آیا تو اچانک پتہ چلا کہ ارے، ہم تو تیر انداز بھی ہیں۔ پہلے ہم سمجھا کرتے تھے کہ ہم صرف نشانہ بننے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ کبھی چین کا نشانہ بن گئے، کبھی امریکہ نے شکار کر لیا، کبھی پاکستان نے بندوق تان لی، کبھی سری لنکا نے طمنچہ دکھا دیا۔ لیکن تم نے تیر چلا کر، وہ بھی چین جیسے ملک میں، ثابت کر دیا کہ ہم بھی منہ میں زبان رکھتے ہیں، تیر زیر کمان رکھتے ہیں۔ چین والے یہ دیکھ کر یقیناً چیں بجبیں ہوئے ہوں گے۔

۔غریب قبائلی نوجوان جس نے اپنی زندگی کے پہلے عالمی مقابلے میں ہندستان کو تیراندازی کا پہلا عالمی گولڈ میڈل دلایا اور وہ بھی تب جبکہ اس نے جدید سہولتوں کے بغیر خود اپنی کوششوں سے تیراندازی سیکھی تھی۔

جان ہے تو جہان ہے پیارے

آپ نے سنا ہوگا' جان ہے تو جہان ہے' صحت ہے تو سب کچھ ہے' صحت نہیں تو کچھ بھی نہیں' تندرستی ہزار نعمت ہے اور لائف بوائے ہے جہاں تندرستی ہے وہاں وغیرہ وغیرہ۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ خوشگوار اور کامیاب زندگی کا راز ہے اچھی صحت اور اچھی صحت کا راز ہے صفائی۔ صاف رہئے' صاف کھایئے' صاف پیجئے' صاف پہنئے اور صحت مند رہئے جیسے ہمارے چالیس کلو وزنی پڑوسی پروفیسر ہدہد رہتے ہیں۔

پروفیسر ہدہد کا اصلی نام کیا ہے' ان کا نام پروفیسر ہدہد کیسے پڑا اور کب پڑا۔ یہ ہم تو کیا ہمارے دوسرے پڑوسی بھی آج تک نہیں جان پائے۔ ہاں ان کا نام پروفیسر ہدہد کیوں پڑا اس بارے میں البتہ کئی لوگوں سے سنا ہے کہ --- ان کی شکل کچھ کچھ ہدہد سے ملتی ہے۔ ایک صاحب نے اس روایت کی تصدیق یہ کہتے ہوئے کی کہ ہدہد کی شکل بھی ان سے کافی ملتی ہے۔

بدقسمتی سے ہم نے ہدہد آج تک نہیں دیکھا۔ بلکہ ہمیں شبہ ہے خود ہدہد نے بھی ہمیں نہیں دیکھا ہوگا۔ لہٰذا ان صاحب سے پوچھا "یہ ہدہد کیا ہے اور کیا ہوتا ہے؟"

"ہدہد ایک پرندہ ہے اور پروفیسر ہدہد جیسا ہوتا ہے۔" انہوں نے جواب دیا اور ہم مطمئن ہوگئے کہ ہدہد انہوں نے بھی نہیں دیکھا تھا۔ بہرکیف ہدہد کے بارے میں محدود معلومات کے باوجود پروفیسر ہدہد کے بارے میں ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ صاف ستھرا رہنا انہیں کس قدر پسند ہے۔ ان کا معمول ہے کہ گرمی ہو یا کڑاکے کی سردی' ہمیشہ صبح اٹھ کر پہلے گرم پانی سے نہاتے ہیں' پھر ٹھنڈ سے بجتے ہوئے دانتوں کو کوئلے والے دنت منجن' نیم کی داتن اور آخر میں ٹوتھ پیسٹ سے اچھی طرح صاف کرتے ہیں' پھر

کچھ اور حقیقتیں بھی ابھر کر سامنے آئیں۔ ہماری پیاری وزارت کھیل کود کھیلوں کے فروغ پر کروڑوں روپے خرچ کرتی ہے۔ بڑے بڑے شہروں میں بڑے بڑے اسٹیڈیم بنائے جاتے ہیں۔ کھیلوں کے شاندار عالمی مقابلے منعقد ہوتے ہیں۔ لاکھوں روپے خرچ کرکے غیر ملکی کوچ منگائے جاتے ہیں۔ یہ کوچ مزید لاکھوں روپے خرچ کرکے ہمارے کھلاڑیوں کو تربیت دیتے ہیں۔ جگہ جگہ تربیتی کیمپ لگتے ہیں۔ ہونہار کھلاڑی دور دور سے پکڑ کرلائے جاتے ہیں۔ وزیر اور افسر دور دور کے غیر ملکی دورے کرکے آتے ہیں۔ تب کہیں جاکر بے چاری وزارت کھیل کود اپنے بجٹ کی پوری رقم خرچ کرپاتی ہے۔

ایک طرف تو اتنی دوڑ دھوپ ہوتی ہے اور دوسری طرف معاف کرنا، تم جیسے ناشکرے لوگ ہیں۔ جو دھوپ میں دوڑ دوڑ کر تمام سرکاری سہولتوں پر پانی پھیرتے ہوئے خود ہی کھلاڑی بن جاتے ہیں اور دیسات میں پڑے پڑے مفت میں قومی ریکارڈ توڑتے رہتے ہیں، جس سے وزارت کھیل کود کے کروڑوں روپے کا خرچ بے کار چلا جاتا ہے۔ یہ تو کوئی اچھی بات نہ ہوئی لمبا رام۔ بھلا ہو وزارت کھیل کود اور اس کی اسپورٹس اتھارٹی کا جس کے افسر تمہیں راجستھان کے کسی گاؤں سے پکڑ کرلے آئے، ورنہ تم تو سرکاری اجازت کے بغیر ہی عالمی ریکارڈ توڑ دیتے۔

بارسلونا اولمپک میں تم سے کافی امیدیں وابستہ تھیں۔ ہاکی، ٹینس، باکسنگ، ٹریکنگ اور پہلوانی میں بعض لوگوں کے بقول بری طرح، مگر ہماری رائے میں اچھی طرح ہارنے کے بعد ہم ہندستانیوں کی تمام امیدیں تم پر ٹکی ہوئی تھیں۔ ہمیں پورا اندیشہ ہو چلا تھا کہ تم باز نہیں آؤ گے۔ کوئی نہ کوئی میڈل ضرور جیت کر رہو گے۔ لیکن جب اسپین کی ہواؤں کا رخ تمہارے خلاف چلا گیا اور یہ خبر ملی کہ تم بھی اوروں کی طرح مقابلے سے باہر ہو گئے ہو تو ہماری خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا۔

اس بات پر تمہیں غصہ تو ضرور آئے گا مگر معاف کرنا پیارے بھائی، ہماری خوشی غیر واجب نہیں تھی۔ ذرا سوچو، ہندستان کے تمام کھلاڑی اولمپک میں ہار گئے ہیں۔ اگر ایسے میں اکیلے تم، ایک میڈل لے آتے تو یہ وزارت کھیل کود اور اسپورٹس اتھارٹی کے لئے کس قدر شرم کا مقام ہوتا! ظاہر ہے تمہارے میڈل لانے کا مطلب یہ ہوتا کہ ہر سال شہری کھلاڑیوں پر ہم جو کروڑوں روپے تربیت وغیرہ کے لئے خرچ کرتے ہیں وہ سب بے کار ہے، اور یہ کہ تم جیسے گنوار دیہاتی مفت میں میڈل لاسکتے ہیں!

یہی وجہ ہے کہ تمہاری ناکامی پر ہم نے اور ہم سے زیادہ وزارت کھیل کود کے افسروں نے چین کا سانس لیا۔

۔یوروپ کی سرد ہواؤں کا درست اندازہ نہ ہونے کے سبب اس کے تیر درست نشانہ پر نہیں لگے۔

تم آج کل اس فکر میں ہو گے اور سوچ سوچ کر حیران ہو رہے ہو گے کہ چین میں بہ آسانی مقابلہ جیتنے کے بعد آخر تمہارے تیر کمان کو اور تمہارے فن کو کیا ہو گیا ہے جو تم بار سلونا میں اتنی آسانی سے ہار گئے۔ ہم بھی حیران تھے۔ چنانچہ اپنے دوست میاں عبدالقدوس سے ہم نے اس کی وجہ پوچھی تو جانتے ہو، انہوں نے کیا کہا؟ انہوں نے کہا۔

اس کی وجہ ہے وہ سرکاری تربیت جو تم نے چین میں جیتنے کے بعد پچھلے دنوں حاصل کی تھی!

☆ ☆ ☆

غریبی کی سطح کے اوپر

غریبی کی سطح سے اوپر رہنے والوں کے حالات دن بدن خراب ہوتے جارہے ہیں۔ وجہ ہے کمر توڑ مہنگائی! جس نے متوسط طبقے کے تمام لوگوں کا ماہانہ بجٹ بگاڑ کر رکھ دیا ہے۔

ویسے دیکھا جائے تو حالات غریبی کی سطح سے نیچے رہنے والوں کے بھی خراب ہیں لیکن ان کے حالات کب خراب نہیں تھے؟ یوں بھی ان کے حالات بس دیکھنے میں ہی خراب دکھائی دیتے ہیں۔

غریبی کی سطح اور ایک فلائی اوور کے نیچے فٹ پاتھ پر رات گذارنے والے ایک شخص نے اپنے ہم رتبہ شخص سے کہا۔

"سنا ہے بازار سے چینی غائب ہوگئی ہے!"

"اچھا کب؟" دوسرے شخص نے حیرت سے میلی ٹانگ کھجاتے ہوئے پوچھا۔

"آج ہی اخبار میں تھا کہ چینی پندرہ کلو سے کم میں کہیں دستیاب نہیں ہے اور بعض علاقوں میں تو کسی قیمت پر بھی نہیں مل رہی ہے۔ بالکل غائب ہوگئی ہے۔ بے چارے دفتری بابوؤں کو بنا شکر کی چائے پئے ڈیوٹی پر جانا پڑ رہا ہے!" پہلے شخص نے گردن پر رینگنے والی ایک جوں پکڑتے ہوئے کہا۔

"اوہو! یہ تو سچ مچ برا ہوا۔ کیا حکومت کچھ نہیں کر رہی ہے؟"

"کر رہی ہے۔ سنا ہے باہر سے چینی امپورٹ کی جارہی ہے۔"

"امپورٹ!؟" دوسرا شخص حیرت کے مارے اچھل پڑا۔ اور اچھلنے کے بعد کان سے بجھی ہوئی بیڑی کا ٹکڑا نکال کر سلگاتے ہوئے بولا۔

"لیکن چھ ماہ پہلے تو ہم چینی ایکسپورٹ کر رہے تھے جس سے غیر ملکی زر مبادلہ کے خزانہ میں کافی اضافہ ہو رہا تھا۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو!" پہلے شخص نے دوسرے شخص کی بیڑی کے دھوئیں سے آہ سرد بھرتے ہوئے کہا۔ "لیکن میرے دوست یہ دنیا سرائے فانی ہے۔ ہر چیز یہاں کی آنی جانی ہے۔ اور کل جہاں بستی

تھیں خوشیاں آج ہے ماتم وہاں۔ لہٰذا حالات بدلتے کیا دیر لگتی ہے۔ آج جو چیز ایکسپورٹ ہو رہی ہے کل وہی امپورٹ کرنی پڑ سکتی ہے۔ ذرا ایک کش دینا۔"

"چلو کوئی بات نہیں۔ چینی امپورٹ ہونے کے بعد بے چارے بابوؤں کی چائے تو میٹھی ہو جائے گی۔" دوسرا شخص اپنی پھٹی ہوئی آستین موڑتے ہوئے بولا۔

"وہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن اور بھی مصیبتیں ہیں۔ گھی منگا ہو گیا ہے' ڈبل روٹی کے دام بڑھ گئے ہیں۔ راشن میں گیہوں اور چاول کی بجائے کوڑا کرکٹ تقسیم ہونے لگا ہے۔ صابن ٹوتھ پیسٹ' و۔انشنگ کریم اور چنا مونگ پھلی جیسے لگژری آئٹم تک مہنگے ہو گئے ہیں جس کی وجہ سے لوگوں کا بجٹ بگڑ گیا ہے اور انہیں اپنا اسٹینڈرڈ نیچے گرانا پڑ رہا ہے۔"

"چچ چچ چچ!" دوسرے شخص نے ٹانگ کے پاس رینگنے والے کھٹمل کو مسلتے ہوئے افسوس کا اظہار کیا۔ "بے چارے بابو لوگ جانے جیسے گذارا کر رہے ہوں گے۔ لپ اسٹک بھی تو مہنگی ہو گئی ہو گی؟"

"اور کیا! اس کے دام سنا ہے آسمان چھو رہے ہیں۔"

"اوفوہ! اور پرفیوم وہسکی؟"

"اس کی قیمت تو چار مہینے پہلے فلٹر سگریٹوں کے ساتھ ہی بڑھ گئی تھی بھیا!" پہلے والے نے اپنی گدڑی کے اندر سے سگریٹ کا ایک ٹوٹا برآمد کر کے کہا۔

"یعنی جب پٹرول اور گیس کی قیمتوں میں اچانک اضافہ ہوا تھا؟"

"ہاں تم ٹھیک کہتے ہو۔ یہ تبھی کی بات ہے۔ اب پٹرول پر دس فیصد سرچارج اور لگ گیا ہے۔"

"کیا کہا!" دوسرا شخص اچھل پڑا۔ "پھر تو بے چارے مڈل کلاس والوں کا اسکوٹر اور کار میں چلنا پھرنا بھی دوبھر ہو جائے گا۔"

"ہاں اور کیا۔" پہلا شخص اپنے بھیک کے کٹورے سے سکے نکال کر گننے لگا۔ "خدا ان کے حال پر رحم کرے۔"

"آمین!" دوسرے نے بھی اپنے المونیم کے کٹورے سے سکے نکالتے ہوئے کہا۔ "اللہ کا بڑا کرم ہے کہ اس نے ہمیں غریبی کی سطح سے نیچے پیدا کیا اور چینی' تیل' صابن' کریم جیسی چیزوں سے بے نیاز رکھا۔ ورنہ ہم تو اس منہگائی سے مر ہی جاتے!"

"بے شک!"

"آؤ چلو۔ ڈھابے پر چلتے ہیں۔ شاید کوئی سیٹھ خیرات میں کھانا کھلانے آجائے!"

"چلو!"

☆ ☆ ☆

ایک گدھا بوٹ کلب میں

یہ ان دنوں کی بات ہے جب دہلی کے بوٹ کلب میں ریلیوں پر پابندی نہیں لگی تھی۔ کل ہند انجمن بہبودئی حیوانات (اینمل ویلفیئر سوسائٹی آف انڈیا) کی جانب سے بوٹ کلب میدان پر ایک زبردست ریلی ہوئی جس میں اونٹ ہاتھی گھوڑے کتے اور اسکولی بچے بڑی تعداد میں شریک ہوئے۔

تقریب کا افتتاح سابق صدر جمہوریہ کی تقریر سے ہوا جنھوں نے جانوروں پر بڑھتے ہوئے مظالم اور بے رحمی کے برتاؤ پر تشویش کا اظہار کیا اور کہا کہ حیوانوں سے پیار اور محبت سے پیش آنے کا جذبہ دھیرے دھیرے ختم ہوتا جارہا ہے۔ دیگر مقررین نے گوشت خوروں کو آڑے ہاتھوں لیا اور کہا کہ ان کی وجہ سے جانوروں کی تعداد کم ہوتی جارہی ہے اور ہوسکتا ہے بعض جانور کچھ عرصہ بعد بالکل ہی ناپید ہوجائیں۔ تقریب کے اختتام پر تمام بے دمے حاضرین و سامعین نے کھڑے ہوکر حلف لیا۔

"میں سچے من سے پرگیا کرتا ہوں کہ بھوک مٹانے کے لئے، تعلیم کے لئے، دل بہلاؤ کے لئے، یا روزی روٹی کے لئے نہ جانوروں سے کوئی بے رحمی برتوں گا نہ کسی کو برتنے دوں گا!"

دم دار حاضرین اس دوران حیرت سے ایک دوسرے کو تکتے رہے۔

بعد میں انجمن کی طرف سے ایک میمورنڈم دیا گیا جس میں حکومت سے اپیل کی گئی کہ وہ اقوام متحدہ سے اس طرز پر حیوانات کے حقوق کا ایک چارٹر جاری کرنے کے لئے کہے جس طرز پر انسانی حقوق کا چارٹر جاری کیا گیا تھا۔

جس وقت یہ سب ہو رہا تھا، ٹھیک اسی وقت بوٹ کلب سے کچھ دور انڈیا گیٹ کے پاس دہلی پولس کا ایک کانسٹبل سڑک کے کنارے کھڑے ایک ایسے گدھے کو ڈانٹ رہا تھا جو شکل سے بالکل گدھا معلوم ہوتا تھا۔

"کیوں بے گدھے، ادھر آنے کی ہمت کیسے ہوئی تیری؟ وایس جاتا ہے یا جماؤں ڈنڈا؟" کانسٹبل

نے آنکھیں نکال کر کہا۔

لیکن گدھے پر ڈانٹ کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ بت بنا کھڑا رہا۔

"ابے گدھے کی اولاد، میں بجتھی سے کہہ رہ ہوں۔ کیا کرنے آیا ہے یہاں؟" کانسٹبل پھر غرایا۔

اس مرتبہ گدھے نے اپنا سر اوپر اٹھایا اور بولا۔۔

"معاف کیجئے گا جناب یہ انداز گفتگو قطعی غیر شریفانہ ہے۔ کم از کم مجھے یہ بالکل پسند نہیں۔ کیا آپ ایک شریف گدھے کے ساتھ شرافت سے نہیں پیش آسکتے؟"

"شرافت!؟" کانسٹبل غصے کے مارے چیخ اٹھا۔ "ابے گدھا ہو کر زبان چلاتا ہے؟ واپس چلا جا سالے نہیں تو ایک سو سات سترہ میں اندر کردوں گا۔ جانتا نہیں یہاں جانوروں کی ریلی ہو رہی ہے۔ بڑے بڑے جانور اور بڑے بڑے نیتا آئے ہوئے ہیں۔ سیکورٹی کی وجہ سے کسی ایرے غیرے کو یہاں سے آگے جانے کی اجازت نہیں ہے۔"

"لیکن جناب میں کوئی ایرا غیرا نہیں ایک گدھا ہوں۔ میرا مالک کہیں کھو گیا ہے اور میں بارہ بنکی سے سیدھا ریلی میں شریک ہونے کے لئے آیا ہوں۔"

"ریلی کا دعوت نامہ ہے تیرے پاس؟" کانسٹبل نے پوچھا۔

"نہیں میں ان لوگوں سے یہی پوچھنے آیا ہوں کہ مجھی ریلی میں کیوں نہیں بلایا گیا۔ کیا گدھا جانور نہیں ہوتا؟ اگر ہوتا ہے تو جانوروں کے ساتھ انسانی تفریق اور امتیازی برتاؤ کیوں؟"

"اچھا! تو یہاں پروٹسٹ کرنے آیا ہے۔ کس پارٹی سے تعلق ہے تیرا؟"

"کسی سے نہیں۔"

"تو کیا آتنک وادی ہے۔"

"نہیں!" گدھا ہنس پڑا۔ "بھلا گدھا بھی آتنک وادی ہو سکتا ہے داروغہ صاحب! آپ بھی مذاق کرتے ہیں!"

داروغہ کا لفظ سنتے ہی کانسٹبل کا غصہ ٹھنڈا پڑ گیا اور اس نے گدھے کو ریلی میں جانے کی اجازت دے دی۔

لیکن جیسے ہی گدھا ریلی کے قریب پہنچا ریلی کے ایک منتظم نے اسے دیکھ لیا اور لاٹھی لے کر اس کی طرف دوڑ پڑا۔

"ہٹ۔ ہٹ۔ ہٹ۔ باہر نکل۔ نہ جانے کہاں سے آگیا کم بخت ریلی کی شوبھا بگاڑنے!" وہ کہتا جا رہا تھا۔

گدھے نے خاموشی سے یہ سب سنا اور دم دبا کر واپس چل دیا۔

☆ ☆ ☆

سارے جہاں سے اچھا

میاں عبدالقدوس کہہ رہے تھے۔

"ہم ہندوستانیوں کی سب سے بڑی بدقسمتی یہ ہے کہ ہندوستان میں پیدا ہوئے ہیں! کاش ہم ہندوستان میں نہیں آسٹریلیا میں پیدا ہوئے ہوتے اور ہندوستان، ہندوستان میں نہیں آسٹریلیا میں ہوتا! جانتے ہو میری موجودہ زندگی کی سب سے بڑی خواہش کیا ہے؟"

ہم نے حسب عادت پورا سوال سننے سے پہلے ہی نفی میں سر ہلا دیا۔

"سب سے بڑی خواہش اور میرے دل کی دلی تمنا یہ ہے کہ میری دوسری پیدائش آسٹریلیا میں ہو۔"

"اور اس موجودہ پیدائش کا کیا ہوگا؟" ہم نے چٹکی لی۔

"اس پیدائش کو میں رائٹ آف (WRITE OFF) کر دینا چاہتا ہوں۔"

"میرا خیال ہے کالعدم کرنا زیادہ مناسب رہے گا۔" ہم نے پھر چٹکی لی۔

"تمہارا خیال ٹھیک ہے۔" انہوں نے کہا۔ "لیکن مشکل یہ ہے کہ اردو والے کل عدم کو کال عدم لکھتے ہیں۔ اس لئے غلط فہمی پیدا ہونے کا امکان ہے۔ بہرحال کچھ بھی ہو، میں نے آسٹریلیا کا ویزا فارم بھی منگا لیا ہے۔"

"الٰہی خیر! معاملہ کچھ سنجیدہ معلوم ہوتا ہے۔" ہم سچ مچ فکر مند ہو گئے۔ میاں عبدالقدوس کی رفاقت کے بغیر رہنے کا ہم تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ آخر وہی تو میلوں تک پھیلی خاموشی اور صدیوں پر محیط تنہائی میں ہمارے رفیق ہیں، جن سے جینے کا تھوڑا بہت حوصلہ ملتا رہتا ہے۔ اس لئے ہم نے انہیں

سمجھایا۔

"خدا کے لئے خاں صاحب۔ ایسا غضب نہ کیجئے گا۔ آخر آپ آسٹریلیا کیوں جانا چاہتے ہیں؟"

"ایک وجہ ہو تو بتاؤں۔" انہوں نے بلا کی سنجیدگی سے حقہ کا ایک کش لیا۔ "اس کی کئی وجوہ ہیں۔ بلکہ کئی وجوہات ہیں۔"

"مثلاً کچھ تو بتایئے۔"

"ایک وجہ تو یہ ہے کہ ہندوستان کی بڑھتی ہوئی آبادی کے بارے میں حکومت کا یہ بیان کافی مشہور ہے کہ ہم ایک سال میں ایک آسٹریلیا پیدا کر لیتے ہیں، جس کی آبادی ڈیڑھ کروڑ ہے۔ میں سوچتا ہوں جب ہم ایک سال میں آسٹریلیا پیدا کر لیتے ہیں تو خود آسٹریلیا میں کیوں نہیں پیدا ہو سکتے؟ دوسری وجہ یہ ہے کہ آسٹریلیا ساری دنیا سے الگ تھلگ واقع ہوا ہے۔ پہلی اور دوسری عالمی جنگ کے دوران ساری دنیا میں عالمی جنگ چل رہی تھی مگر وہاں کے لوگ آرام سے کرکٹ کھیل رہے تھے۔ پھر الگ تھلگ ہونے کی وجہ سے وہاں جانور بھی دنیا سے نرالے پائے جاتے ہیں۔ وہاں ایسے پرندے ہیں جو انڈے کے بجائے بچے دیتے ہیں۔ ایسے جانور ہیں جو انڈے دیتے ہیں اور بچوں کو دودھ پلاتے ہیں۔ ایسے چوپائے ہیں جو ہوا میں اڑ سکتے ہیں۔ بلکہ ایک چوپایا تو ایسا ہے جو صرف دو ٹانگوں پر چلتا ہے۔ کنگارو۔ اس کے علاوہ بومرانگ چاقو بھی وہیں کی ایجاد ہے جو دشمن پر وار کر کے واپس آجاتا ہے اور کئی بار چاقو پھینکنے والے کو ہی زخمی کر دیتا ہے۔ اور بھی کئی وجوہ ہیں۔"

"وہ بھی بتا دیجئے۔ آپ کی معلومات کافی مرعوب کن ہے۔" ہم نے اعتراف کیا۔

"آسٹریلیا واحد ملک ہے جو براعظم بھی ہے اور ملک بھی۔ زیادہ تر ملک ساحل سمندر پر بسا ہوا ہے۔ ہمارے ملک میں بیشتر آبادی دیہات میں ہے جبکہ وہاں بیشتر آبادی شہروں میں رہتی ہے، جن میں ہر طرح کی جدید سہولتیں موجود ہیں وغیرہ وغیرہ۔ لیکن سب سے بڑی وجہ جس کی وجہ سے میں وہاں جانا چاہتا ہوں یہ ہے کہ وہاں کئی چیزیں ایسی ہیں جو بلکل نہیں ہیں۔"

"مثلاً؟"

"مثلاً وہاں اجودھیا تنازعہ نہیں، منڈل کمیشن نہیں، یہاں تک کہ وی پی سنگھ، لال کرشن اڈوانی اور ہرشد مہتہ بھی وہاں نہیں رہتے۔ چنانچہ شہاب الدین اور شاہی امام بھی نہیں پائے جاتے۔ لہٰذا میں نے ٹھان لی ہے کہ وہیں جا کر رہوں گا اور چین کی بنسی بجاؤں گا جو حال ہیں میں میرا بھانجہ کلکتہ کے چائنا ٹاؤن سے خرید کر لایا ہے۔"

"ہم نے بہت سوچ کر ایک ترپ کا پتہ نکالا۔

"آپ نے جو وجہیں بتائی ہیں وہ خاصی معقول ہیں لیکن دو وجہیں ایسی بھی ہیں خاں صاحب، جن

کی وجہ سے آپ کو آسٹریلیا ہرگز نہیں جانا چاہئے۔''

''دوسری وجہ کیا ہے؟'' انہوں نے جھٹ پوچھا۔

''دوسری وجہ یہ ہے کہ وہاں آپ کو حلیم کھانے کو کہیں نہیں ملے گا اور پہلی وجہ اس سے بھی زیادہ خطرناک ہے۔''

''وہ کیا؟'' ان کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔

''وہ یہ کہ وہاں نہاری اور طاہری بھی نہیں بنتی۔''

''لاحول ولا قوت! اس کا تو خیال ہی نہیں رہا۔'' انہوں نے ماتھے پر ہاتھ مارا اور جیب سے ویزا فارم نکال کر پرزہ پرزہ کر دیا۔

''آسٹریلیا کا پروگرام کینسل۔'' وہ بولے۔

''اور وہ کنگارو، بومرانگ، انڈے، بچے اور ساحل سمندر'' ہم نے چھیڑا۔

''اماں لعنت بھیجو۔ اپنے وطن میں جو کچھ ہے وہ پوری دنیا میں نہیں۔ یہاں آدمی غربت میں نہاری اور پریشانی میں حلیم تو کھا سکتا ہے۔ باہر تو بھوکا ہی مرجائے گا! شکر ہے اس رب کا جس نے ہمیں یہاں پیدا کیا۔''

ہم نے دیکھا ان کی آنکھیں نم تھیں، اور فخر سے چمک رہی تھیں!

☆ ☆ ☆

اداسی

اس روز نہ جانے کیوں جی بہت اداس تھا۔

میاں عبدالقدوس دیکھتے ہی پیچھے پڑ گئے۔

''سر پر بکھرے بال' چہرے پر ہوائیاں' آنکھوں میں ویرانی اور ہونٹوں پر سرد آہیں! خیریت تو ہے میرے عزیز' منڈل کمیشن اور ایودھیا تنازعہ کے علاوہ ایسا اور کیا ہوا ہے جس نے تمہاری یہ حالت بنادی ہے۔''

ہم چپ رہے۔

انہوں نے حقے کے چند طویل کش لئے پھر بولے۔ ''ویسے تو یہ علامتیں دہلی شہر کی فضائی آلودگی اور کثافت کا نتیجہ بھی ہو سکتی ہیں' کیونکہ اس وقت ہمارے پیارے شہر کا شمار دنیا کے سب سے زیادہ آلودہ شہروں میں ہونے لگا ہے۔ لیکن میں تمہیں اتنا شریف آدمی نہیں سمجھتا کہ اس آلودگی سے اتنے متاثر ہو جاؤ گے۔ لگتا ہے معاملہ کچھ گہرا ہے۔''

یہ کہتے کہتے وہ آگے کی طرف جھکے اور ہمارے کان کے قریب منھ لا کر بولے ''کہیں عشق میں تو ناکام نہیں ہو گئے ہو میاں۔ محبوبہ نے کسی اور سے تو...''

ہم اور بھی چپ ہو گئے۔

''انہوں نے حقے کے کچھ اور کش لئے پھر کہنے لگے۔'' میرے دوست مجنوں اور فرہاد بننے سے بچو' روغن بادام شیریں اور خمیرہ گاؤزبان عنبریں کا باقاعدہ استعمال کرو' انشاء اللہ چہرے پر رونق آجائے گی اور سگریٹ نوشی مخالف مہم کا اشتہار بننے سے بچ جاؤ گے' جو تم اس وقت نظر آرہے ہو۔''

صاف برتنوں کو صاف پانی میں صاف پاؤڈر سے دھوکر ان میں ناشتہ نوش کرتے ہیں۔ دوپہر اور رات کے کھانے میں اس درجہ احتیاط برتتے ہیں کہ پلاؤ ہو یا دال، کباب ہو یا قیمہ، پہلے ہر چیز کو اچھی طرح کرید کر دیکھ لیتے ہیں، پھر اس میں سے زیرہ، کالی مرچ اور کالی الائچی احتیاطاً" الگ کر دیتے ہیں تاکہ کھانے کے ساتھ علی الترتیب مچھر، مکھی اور کاکروچ معدے میں چلے جانے کا وہم باقی نہ رہے۔

اور یہ بھی تب ہے جب وہ بیوی کے مسلسل احتجاج کے باوجود باورچی خانہ میں بلاناغہ صبح شام کیڑے مار دوا کا چھڑکاؤ کرتے رہتے ہیں۔ گھر کے دوسرے حصے بھی مختلف کیڑے مار دواؤں اور فنائل وغیرہ سے اس بری طرح مہکتے رہتے ہیں کہ مچھر، مکھی اور کاکروچ تو کیا بست سے پڑوسی بھی ان کے گھر آنے سے کتراتے ہیں۔ کہتے ہیں ان کے گھر جاتے ہی ایسا لگتا ہے جیسے کسی میونسپل اسپتال کے آپریشن تھیٹر میں آگئے ہوں۔

ہم بھی اول تو ان کے گھر جاتے نہیں اور اگر کبھی ہنگامی حالات میں جانا بھی پڑے تو ایک بڑا سا تولیہ ناک پر ضرور رکھ لیتے ہیں اور جلدی جلدی پس تولیہ ضروری باتیں کرکے واپس آجاتے ہیں۔

یہ سچ ہے یا نہیں خدا جانے، مگر سنا ہے کہ اب ان کے گھر کی منڈیریں بھی سونی ہوگئی ہیں۔ آج کل ان پر نہ چڑیاں شور مچاتی ہیں، نہ کوے چہچہاتے ہیں۔ بس کبھی کبھار موڈ میں ہوں تو پروفیسر ہدہد خود ہی کچھ دیر کے لیے کسی منڈیر پر جا بیٹھتے ہیں اور آواز دے کہاں ہے دنیا مری جواں ہے جیسا کوئی اداس گیت گنگنا کر نیچے اتر آتے ہیں۔

دروغ بر گردن راوی۔ یہ بھی سننے میں آیا ہے کہ ان کے یہاں صابن کا خرچ بہت بڑھ گیا ہے۔ جب سے دہلی میں وبائیں پھیلی ہیں تب سے وہ اتنے محتاط ہوگئے ہیں کہ کچھ بھی کھانے سے پہلے اور بعد میں صابن سے کم از کم دو بار ضرور ہاتھ دھولیتے ہیں۔ اور ہمیں تو یقین نہیں آتا لیکن لوگ قسمیں کھا کر کہتے ہیں کہ انہوں نے پروفیسر ہدہد کو ہاتھ دھونے کے لیے رکھے ہوئے پانی کو بھی صابن سے دھونے کی کوشش کرتے ہوئے بچشم خود دیکھا ہے۔ اور یہ کہنے کی تو ضرورت ہی نہیں کہ اکثر اس کوشش میں وہ صابن سے ہی ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔

یہ سب سن کر کبھی کبھار بچپن کے دوست بھائی الیاس تیاگی المتخلص بہ فقیر کی یاد آجاتی ہے، جو اس بلا کے صفائی پسند واقع ہوئے ہیں کہ پروفیسر ہدہد ان کے سامنے ایسے معلوم ہوتے ہیں جیسے کافور میں بسے کفنی کورے لٹھے کے آگے نہاری کی دیگ صاف کرنے کا پونچھا۔ یا آپریشن تھیٹر میں استعمال ہونے والی ڈس انفکٹ شدہ چادر کے سامنے کسی مسلم ہوٹل میں واش بیسن کے ساتھ ٹنگا ہوا تولیہ، جس سے ہاتھ پونچھنے کے بعد پانچ سو واں گاہک بھی اطمینان سے الحمدللہ کی ڈکار لے کر "تو چیز بڑی ہے مست مست" گانے لگتا ہے۔ یہ چاروں مثالیں خود بھائی الیاس کی فکر، بلکہ یوں کہئے بے فکری کا نتیجہ ہیں۔)

کوئی اور موقعہ ہوتا تو خاں صاحب نے جو نقشہ ہمارا کھینچا تھا' اس پر بے تحاشا ہنسی آجاتی' مگر اس وقت نہ جانے کیوں ان کی بات پر جی چاہا کہ دہاڑیں مار کر رو پڑیں۔

ہماری حالت پر میاں عبدالقدوس کو کچھ تشویش ہونے لگی۔ انہوں نے ہاتھ بڑھا کر ہماری نبض ٹٹولی' پھر اپنی نبض پکڑ کر دونوں کا تقابلی موازنہ کیا' قریب آکر ہماری آنکھوں میں جھانکا' ناک اور کان ہلا کر دیکھے اور منھ کھول کر "آع" کرنے کو کہا۔

"آخر ہمیں کہنا پڑا۔ "معاف کیجئے خاں صاحب۔ فکر نہ کیجئے ہم بالکل ٹھیک ہیں۔"

"ہش! خاموش رہو تمہیں کیا پتہ' تم ٹھیک ہو یا نہیں۔ زبان باہر نکال کر آع کرو۔"

ہم نے تھوڑی سی زبان دکھادی۔

"اور دکھاؤ۔" حکم ہوا۔

ہم نے اور دکھادی۔ مگر وہ بولے۔ "اور دکھاؤ۔"

"کہئے تو زبان نکال کر آپ کے ہاتھ پر رکھ دیں۔" ہم نے جھنجھلا کر کہا۔

"بے وقوف مت بنو۔ اچھی طرح زبان نکال کر دکھاؤ۔" انہوں نے اصرار کیا۔

ہم نے خوب اچھی طرح زبان نکال دی۔

"بس بس منھ نہ چڑاؤ۔ رہنے دو۔" انہوں نے کہا اور ہم نے جھٹ منھ بند کر لیا۔

اس کے بعد انہوں نے دائیں ہاتھ کی انگلیوں پر کچھ گنا اور گن کر اسے بائیں ہاتھ کی انگلیوں سے گھٹایا' تقسیم کیا' ضرب کیا' اور خدا جانے کیا کیا کیا۔ آخر میں بولے۔

"یہ سب مالیخولیا کے آثار ہیں۔ ہو سکتا ہے خفقان بھی ہو۔ اس لئے فوراً محلہ مطربان کے خواجہ سرطان سے رجوع کرو جن کی سوانحی کتاب بوریئے سے مصلے تک میں نے تمہیں پچھلے دنوں پڑھنے کو دی تھی' ان سے کوئی زوردار تعویز بنواؤ اور اس فقیر بے تقصیر کے حق میں دعائے خیر کے بعد دو روز کا فاقہ کرو انشاء اللہ افاقہ ہوگا۔" یہ کہہ کر وہ پھر حقے کے کش لینے لگے۔

"آپ خواہ مخواہ فکر مند ہو رہے ہیں۔ ہم بالکل ٹھیک ہیں خاں صاحب' چاہیں تو قسم لے لیجئے۔" ہم نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی۔

"جھوٹی قسم کھا کر مجھے بھی گناہ گار کرنا چاہتے ہو۔ اگر خواجہ سرطان کے تعویز پر یقین نہیں رکھتے تو ایک اور علاج ہے۔ سوچنا چھوڑ دو۔"

"سوچنا چھوڑ دوں؟ کیا مطلب؟" ہم نے پوچھا۔

"مطلب یہ کہ یہ مت سوچو اگر ایودھیا مذاکرات کامیاب نہیں ہو سکے' کشمیر میں حالات بدستور خراب ہیں' منڈل کمیشن اور مندر مسجد کی لڑائی نے ہوا میں زہر گھول دیا ہے' سیٹلائٹ ٹی وی ہمارا کلچر تباہ

کر رہا ہے اور ملٹی نیشنل کمپنیاں دونوں ہاتھوں سے ہمیں لوٹ رہی ہیں' تو اس میں خدانخواستہ تمہارا کوئی ہاتھ ہے۔ اس دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ نہ تمہاری مرضی سے ہو رہا ہے نہ میری مرضی سے۔ اس لئے جو ہو رہا ہے ہونے دو۔ یہ سوچو گے تو جی ہلکا ہو گا۔''

میاں عبدالقدوس کی بات پر سینے سے ایک گہری آہ نکلی اور ایسا لگا جیسے جی سچ مچ کچھ ہلکا ہو گیا ہے۔ کچھ دیر کے لئے!

☆ ☆ ☆

بھائی الیاس عجیب و غریب شخصیت کے مالک ہیں۔ ہر ہفتہ ایک نیا تکیہ کلام وضع کرتے ہیں اور جب بھی جو بات دماغ میں سما جائے اس کے پیچھے پڑ جاتے ہیں۔ چنانچہ جب انہیں کیمیا بنانے کا شوق ہوا تو ہر چند کہ کاروباری پریشانیوں نے انہیں کشتہ روزگار بنا رکھا تھا، مگر وہ برسوں دہرہ دون کے جنگلوں میں جنگلی گھی کوار اور چوگوشی تر پھلا ڈھونڈتے رہے تاکہ پارہ کو قائم کرنے کا وہ صحیح نسخہ تیار ہو جائے جو ایک عیار بزرگ سیاہ ریش نے انہیں جلال میں آکر مراقبہ کے عالم میں بتایا تھا۔ پھر کیمیا کے راستے سے تصوف کی طرف راغب ہوئے تو ایسے بلا کے صوفی بنے کہ روزانہ صبح کو زعفرانی لباس میں سر پر سبز عمامہ باندھ کر دونوں ہاتھوں میں جلتی ہوئی اگر بتیاں لئے جنگل کی طرف نکل جاتے، شام کو حق ہو، حق ہو کی گردان پر گردن ہلاتے واپس آتے اور اس حالت میں خود بھی کسی بزرگ کا چلتا پھرتا مزار نظر آتے رہتے۔

اسی طرح جب انہیں حکمت کا شوق ہوا تو یہ عالم تھا کہ روز طب یونانی کی نہ جانے کب کب کی بوسیدہ کتابیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر لاتے۔ کوے کی چونچ، الو کے پر اور مینڈک کی کلیجی جیسی چیزوں سے طرح طرح کے امراض کی عجیب و غریب دوائیں اور کشتے بنا کر خود پر ہی ان کے تجربے کرتے اور آئے دن طرح طرح کی بیماریوں میں مبتلا ہوتے رہتے۔[1]

یونانی ادویات میں ان دنوں ان کا عقیدہ اس قدر پختہ تھا کہ ناشتہ میں چائے کی جگہ جوشاندہ پیتے، ڈبل روٹی پر شہد یا مکھن کی جگہ کبھی اطریفل زمانی لگایا جاتا کبھی خمیرہ مروارید مشکی عنبریں۔ دوپہر کے کھانے میں اکثر بکرے کی کلیجی کا عرق خمیرہ گاؤزبان کے ساتھ نوش فرماتے اور رات کے کھانے میں املتاس کے بیجوں سے بگھری ہوئی اڑد کی دال کے ساتھ دانہ خشخاش کی بھجیا دستہ خوان پر موجود ہوتی۔ یہ سب چیزیں کھانے کے بعد ہاضمہ درست رکھنے کے لیے نوسادر سیاہ نمک اور پھٹکری سے تیار کیے گئے معدہ شکن چورن کو سفوف لبوب کبیر کہہ کر خود بھی کھاتے اور اپنی طرح دوسروں کا پیٹ بھی خراب کرتے۔ کبھی کبھار مٹھائی کھانے کو جی چاہتا تو رس گلہ پر آنولہ یا سیب کے مربے کو اور ربڑی پر خمیرہ ابریشم کو ترجیح دیتے۔

پھر جب طب یونانی سے جی اچاٹ ہوا تو ہومیوپیتھی کی طرف آ گئے۔ ہر وقت جیبوں میں درجنوں چھوٹی چھوٹی شیشیاں بھری رہتیں۔ معمولی ہچکی بھی آتی تو اسے شیانکا یا پرانے دمہ کی ابتدائی علامت قرار دے کر کوئی شیشی نکالتے۔ پھر گھڑی سازوں والا یک چشمی آلہ آنکھ پر لگا کر پوست کے دانہ جتنی چار گولیاں شیشی سے نکال کر بدقت تمام الگ کرتے اور انہیں زبان پر رکھ کر دیر تک اس طرح منہ چلاتے رہتے جیسے چیونگم چبا رہے ہوں۔

[1] یہ قصہ مصنف کی اولین کتاب "تحت اللفظ" کے مضمون "ایک آنچ کی کسر" میں مفصل آ چکا ہے۔ پبلشر

ہومیو پیتھی کے بعد انہیں ایلوپیتھی پر یقین ہوگیا اور یہ یقین اتنا بڑھا کہ انہوں نے شہر کے تمام ایم بی بی ایس ڈاکٹروں کو نااہل قرار دے کر خود اپنا کلینک کھولنے کی ٹھان لی۔ ان کے بقول اپنا کلینک کھولنے میں سب سے بڑا فائدہ یہ تھا کہ ان کی بیماریوں کا علاج مفت ہوتا رہتا۔

لوگوں نے بتایا کہ ایلوپیتھ بننا اتنا آسان نہیں۔ کم سے کم آر ایم پی ضرور بننا پڑتا ہے۔ مگر یہ سن کر ان کے ماتھے پر ایک شکن تک نہ آئی۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ بڑے آرام سے آر ایم پی ہو جائیں گے۔ اب اس کے بعد یہ شہر والوں کی اپنی خوش قسمتی تھی کہ انہیں آر ایم پی کا سرٹیفکیٹ دلانے کا وعدہ کرنے والا شخص جعل سازی میں پکڑا گیا اور ان کا کلینک نہ کھلنے سے محتاط اندازہ کے مطابق کئی درجن مریضوں کی جان بچ گئی۔

بھائی الیاس ڈاکٹر تو نہ بن سکے، لیکن ایلوپیتھی کا شوق برقرار رہا اور اس شوق کی تکمیل انہوں نے اس طرح کی کہ خود مریض بن گئے۔ ظاہر ہے اس کام کے لیے کسی ڈگری کی ضرورت نہیں تھی۔ یہ پریکٹس جب خوب چل نکلی تو ایک روز کمر کھجاتے کھجاتے انہیں یکایک خیال آیا کہ ہو نہ ہو یہ اسکن الرجی ہے۔ بس اس خیال کا آنا تھا کہ انہیں بدن کے اور بھی کئی حصوں میں کھجلی محسوس ہونے لگی۔ چنانچہ دائیں ہاتھ سے بایاں بازو اور بائیں ہاتھ سے دایاں بازو کھجاتے ہوئے بھائی الیاس ڈاکٹر کے پاس پہنچ گئے۔ ڈاکٹر نے معائنہ کر کے کہا، الرجی تو کوئی نہیں ہے البتہ شہر میں برسات کی وجہ سے گندگی بڑھ گئی ہے اس لیے جب نہایا کریں تو احتیاطاً پانی میں تھوڑا سا ڈیٹول یا کوئی اور جراثیم کش ڈال لیا کریں کہ جراثیم کا کوئی بھروسہ نہیں۔

انہوں نے ڈاکٹر کی صلاح مان لی اور فوراً بازار سے ایک کریٹ ڈیٹول کی بوتلوں کا لے آئے۔

چند روز بعد ہم ان سے ملنے گئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ان کے بستر پر ایک نہایت نحیف و لاغر شخص لیٹا ہوا ہے اور پورا کمرہ ڈیٹول سے مہک رہا ہے۔ ناک پر رومال رکھ کر غور سے اس شخص کو دیکھا تو وہ بھائی الیاس نکلے۔ گھر والوں سے خیریت پوچھی۔ پتہ چلا کہ معدہ خراب ہوگیا ہے اور یہ سب ڈیٹول کا کیا دھرا ہے۔

ہوا یہ کہ بھائی الیاس نے ڈیٹول کو صرف غسل کے پانی تک محدود نہیں رکھا، بلکہ شیونگ اور ہاتھ دھونے کے پانی میں بھی ڈیٹول کی بوندیں ڈالنے لگے۔ خیر یہاں تک بھی ٹھیک تھا۔ مگر بعد میں یہ ہوا کہ انہوں نے اپنے رومال اور بستر پر بھی ڈیٹول چھڑکنا شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ کپڑوں پر بھی عطر کی بجائے ڈیٹول لگانے لگے۔ (ہم نے دیکھا ان کے کانوں میں بھی ڈیٹول کے پھوئے رکھے تھے جنہیں وہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد کان سے نکال کر سونگھ لیتے تھے تاکہ ناک بھی جراثیم سے پاک رہے۔) حد تو یہ ہوئی کہ

ایک دن انہوں نے کھانے کے ساتھ سلاد میں رکھے ہوئے لیموں اور پیاز پر بھی ڈیٹول چھڑک لیا۔ اس کے بعد خارش تو دور ہو گئی مگر معدہ ایسا خراب ہوا کہ جان کے لالے پڑ گئے۔

ایک دن پروفیسر ہدہد ملے تو ہم نے انہیں احتیاطاً" بھائی الیاس کا قصہ سنا دیا تاکہ جوش ڈس انفکشن میں کہیں وہ بھی اپنا معدہ خراب نہ کر لیں۔ مگر وہ بجائے عبرت پکڑنے کے پہلے بگڑ اور پھر اکڑ گئے۔ بولے--

"تم نے کیا مجھے بے وقوف سمجھ رکھا ہے۔ کبھی گھر آ کر میری جراثیم کش ادویات کی ڈریسنگ ٹیبل دیکھو۔ تمہیں اس پر ڈیٹول کی ایک بھی شیشی نہیں ملے گی۔ میں ڈیٹول پر نہیں بیگون اسپرے اور فنٹ پر بھروسہ کرتا ہوں!"

اس تمام بیان سے قارئین یہ نہ سمجھیں کہ ہم صفائی ستھرائی کا خیال رکھنے والوں کا مذاق اڑا رہے ہیں۔ جی نہیں۔ بیان سے محض اپنی کم مائیگی اور بے بضاعتی کا اظہار مقصود ہے جس کا احساس ہمیں ہر دو مذکورہ اشخاص کے پاس بیٹھ کر اکثر ہوتا ہے۔ خود ہم بھی صفائی کا عموماً کافی خیال رکھتے ہیں۔ گھر میں اپنا تولیہ اور ٹوتھ برش ہی نہیں کنگھا بھی الگ رکھتے ہیں۔ پانی پینے سے پہلے گلاس میں اچھی طرح جھانک لیتے ہیں کہ کہیں اس میں ہم سے پہلے کوئی اور حشرالارض تو اپنی پیاس بجھانے کے چکر میں نہیں ہے۔ سردیوں میں تو نہیں ہاں گرمیوں میں ضرور روزانہ غسل کرتے ہیں۔ تکیوں کے غلاف اور بستر کی چادریں ہر دوسرے دن نہیں تو تیسرے چوتھے روز ضرور بدل ڈالتے ہیں۔ کھانا کھانے سے پہلے ہی نہیں بعد میں بھی ہاتھ دھو لیتے ہیں اور خود کو عام لوگوں سے زیادہ صفائی پسند سمجھتے رہتے ہیں۔

مگر یقین جانئے پروفیسر ہدہد کے سامنے بالعموم اور بھائی الیاس کی موجودگی میں بالخصوص ہمیں ایسا لگتا ہے جیسے ہم ایک باوقار اردو روزنامے کے چیف رپورٹر نہیں کسی مسلم قصاب کی دکان پر قیمہ کوٹنے والے نوکر ہیں۔

پچھلے دنوں اپنے صاف ستھرے رہن سہن کے بارے میں ہماری تمام تر خوش فہمیاں اس وقت ہوا ہو گئیں جب میاں الیاس نے ہمارے گھر میں داخلے کے صرف دس منٹ بعد یہ بیان جاری کر دیا کہ صاف ستھرا رہنے کے معاملے میں ہم دنیا کے انتہائی غیر محتاط لوگوں میں سے ایک ہیں۔ ہوا یہ کہ وہ ہمیں شرف میزبانی بخشنے کے لیے اچانک سہارنپور سے دہلی تشریف لے آئے تھے۔ اگرچہ غریب خانہ پر ان کا قیام صرف تین روز رہا مگر ان تین دنوں میں ہی ہمارے چودہ طبق روشن ہو گئے اور ہمیں اپنی اوقات کا پتہ چل گیا۔

ہم نے اچانک دہلی آمد کا سبب پوچھا۔ کہنے لگے "بس ایسے ہی ذرا قطب مینار اور لال قلعہ دیکھنے کو جی چاہ رہا تھا۔ تم تو جانتے ہی ہو فدوی کو پرانی عمارتیں دیکھنے کا کس قدر شوق ہے۔"

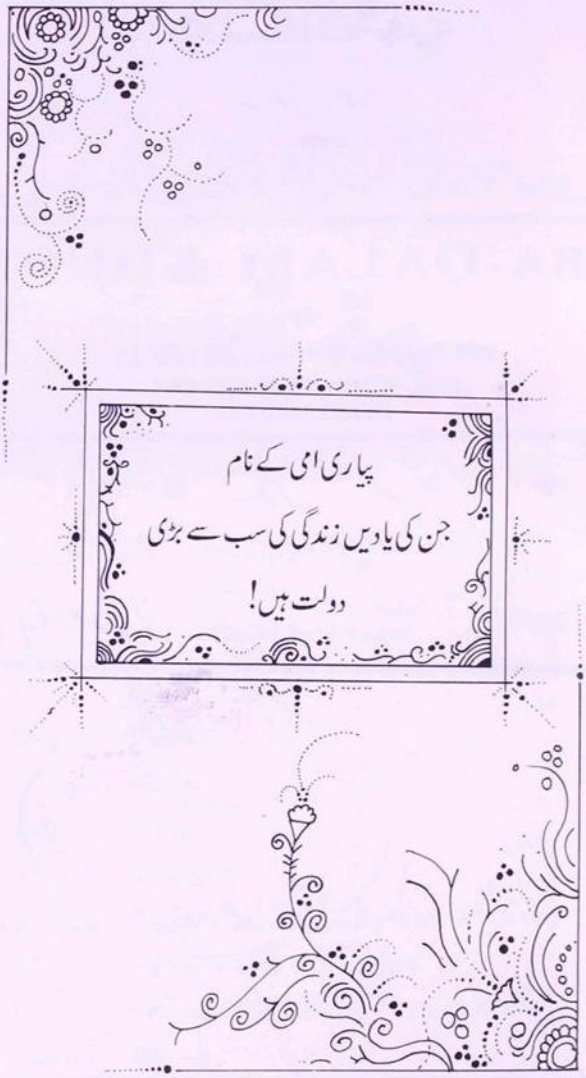
پیاری امی کے نام
جن کی یادیں زندگی کی سب سے بڑی
دولت ہیں!

"مگر جہاں تک ہمیں یاد ہے یہ دونوں عمارتیں آپ کی اچھی طرح دیکھی ہوئی ہیں۔" ہم نے کہا۔

"ہاں لیکن یہ بات بیس سال پہلے کی ہے۔ میرا خیال ہے اس عرصہ میں یہ عمارتیں اور پرانی ہو گئی ہوں گی۔ کیا خیال ہے؟"

ظاہر ہے ہمارے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ لہٰذا خاموش ہو گئے۔

میاں الیاس نے اپنا سامان جھاڑ پونچھ کر ایک طرف رکھا۔ پھر کھڑے ہو کر چاروں طرف گردن گھمائی اور زور سے کئی گہرے سانس لیے۔ اس کے بعد اپنے سامان میں سے کیڑے مار دوا چھڑکنے کا آلہ نکالا اور ہر طرف دوا چھڑکنے لگے۔ ہم نے حیران ہو کر پوچھا یہ کیا کر رہے ہیں؟ تو بولے "ہشت۔ چپ رہو۔ مجھے معلوم ہے تم صفائی کا کتنا کم خیال رکھتے ہو۔ اس لیے پہلے تمہارے گھر کو ڈس انفکٹ کر رہا ہوں۔"

بہت سمجھایا کہ جناب ہم ہر ہفتہ فنٹ کا چھڑکاؤ کرتے ہیں تاکہ گھر کیڑے مکوڑوں اور مچھروں سے پاک رہے۔ مگر وہ مطمئن نہیں ہوئے۔ ہم نے کہا "اچھا تو چلئے ہم اپنا فنٹ اسپرے پمپ دیئے دیتے ہیں۔ اپنی دوا خرچ کر کے شرمندہ تو مت کیجئے۔"

مگر وہ کہاں ماننے والے تھے۔ بولے "نہیں بھئی نہیں، تمہارا کیا اعتبار، پتہ نہیں اپنے پمپ کو دوا بھرنے سے پہلے پانی میں ابال کر ڈس انفکٹ کرتے ہو یا نہیں۔ مجھے تو بھئی اپنے پمپ کا ہی اعتبار ہے۔ ہر روز اسے دوا بھرنے سے پہلے پانی میں ابال کر ڈس انفکٹ کر لیتا ہوں۔"

اس کے بعد ہم مسلسل تین روز تک ان کے پاک صاف رہنے کے طور طریقوں کا مشاہدہ کرتے رہے جس میں بہت سی ایسی باتیں دیکھنے میں آئیں جو اس سے پہلے ہم نے کبھی نہیں دیکھی تھیں۔ مثلاً ہم نے دیکھا کہ وہ جب بھی ہاتھ دھوتے تھے تو اپنے تولیے سے ہاتھ پونچھنے کے بعد دوبارہ ہاتھ دھونے کھڑے ہو جاتے اور پھر دوسرے تولیے سے ہاتھ پونچھتے۔ یہاں تک کہ غسل کرنے کے بعد بھی غسل کرنے لگتے۔

ہم نے پوچھا اس میں کیا بھید ہے؟ کہنے لگے "احتیاط میرے عزیز احتیاط! احتیاط ہمیشہ اچھی رہتی ہے۔ میرا اصول ہے ہاتھ دھونے سے پہلے ہاتھ دھو لینے چاہئیں اور نہانے سے پہلے اچھی طرح نہا لینا چاہئے کیونکہ صحت مند رہنے کے لیے ضروری ہے کہ آدمی بیمار نہ پڑے اور بیماریوں سے بچنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ آدمی بیماریوں سے بچ کر رہے۔"

ہم نے دیکھا، یہ عمل وہ اپنے کھانے کے برتنوں اور پہننے کے کپڑوں پر بھی دوہراتے تھے بلکہ ایک مرتبہ تو انہیں ہاتھ دھوتے وقت صابن کو بھی ایک دوسرے صابن سے دھوتے ہوئے دیکھا۔

وجہ پوچھی تو کہنے لگے "ہاتھ کی صفائی صابن سے ہوتی ہے۔ ایسے میں اگر خود صابن پر ہی کوئی جرثومہ استراحت فرما رہا ہو تو اس سے ہاتھ کی صفائی کیا خاک ہو گی۔ چنانچہ صابن کی صفائی بھی تو کسی چیز

سے ہونی چاہئے۔ اب بے چارا صابن خود تو اپنے آپ کو نہیں دھو سکتا نا!"

ایک روز ہم شربت بنانے کے لیے دو کلو برف بازار سے لائے تو موصوف اسے بھی صابن سے دھونے بیٹھ گئے۔ اس سے پہلے کہ ہم احتجاج کرتے آپ بولے "ہشت! خاموش رہو۔ بازاری برف کا کبھی بھروسہ نہیں کرنا چاہئے۔ کم بخت بغیر دھلے پانی کی برف بنا کر بیچ دیتے ہیں۔"

کچھ دیر بعد برف کی پوری ایک مکعب انچ ڈلی تھما کر فرمایا۔ "لو اب یہ برف ٹھیک طرح صاف ہو گئی ہے۔" اور پھر شربت میں ملانے سے پہلے ڈلی واقعی پوری طرح صاف ہو گئی!

ایک صبح تو حد ہو گئی۔ ہم نے دیکھا وہ شیونگ کے وقت اپنا سارا سامان الٹ پلٹ کر دیکھ رہے تھے۔ پریشانی کی وجہ معلوم کی تو بولے "آئینہ نہیں مل رہا ہے۔"

ہم نے کہا "کوئی بات نہیں، ہمارا آئینہ لے لیجئے۔ ویسے واش بیسن کے ساتھ بھی آئینہ لگا ہوا ہے۔"

مگر وہ ہماری پیشکش پر ناراض ہو گئے۔ کہنے لگے---

"بہت خوب! تم گویا مجھے بھی اپنے ہی جیسا غیر محتاط سمجھتے ہو کہ دوسروں کے آئینہ میں شیو کرتا پھروں گا۔ اگر جراثیم لگ گئے تو؟ جناب عالی میں دوسرے کے آئینے سے شیو کرنا تو دور رہا اس میں اپنی صورت دیکھنے اور سر کے بال بنانے کا بھی روادار نہیں ہوں۔ بیوی کا آئینہ بھی الگ کر رکھا ہے۔ کبھی گھر آ کر دیکھنا۔ ہر واش بیسن پر دو دو آئینے لگے ہوئے ہیں۔ جن پر ہر وقت پردہ پڑا رہتا ہے۔ ایک میرا اور ایک تمہاری بھابی کا۔ نائی کی دکان پر حجامت کرانے جاتا ہوں تو اپنا آئینہ بھی ساتھ میں لے جاتا ہوں!"

اس بیان کے بعد وہ بازار سے بالکل نیا آئینہ خرید کر لائے۔ اسے جراثیم کش اسپرے سے ڈس انفکٹ کیا اور شیو کرنے بیٹھ گئے۔

اس کے بعد وہ تو آئینے میں اپنی صورت دیکھا کیے اور ہم گھنٹوں یوں ہی بیٹھے اپنی بے ثباتی پر غور کرتے رہے!

☆ ☆ ☆

ادب اور ڈاکٹری

ہمارے نقادوں نے اردو ادب پر اتنا کام کیا ہے اور اس قدر تنقید کی ہے کہ اگر اس میں سے تنقید نکال دی جائے تو کچھ زیادہ اردو ادب باقی نہیں بچے گا۔ ادب کا کوئی پہلو اور کوئی موضوع ایسا نہیں ملتا جو نقادوں کی دست برد سے محفوظ رہا ہو۔ بعض نقاد تو اتنے کائیاں ہیں کہ انہوں نے تنقیدوں پر بھی تنقیدیں لکھ دی ہیں۔

اس پر میاں عبدالقدوس نے تبصرہ کیا ہے---

"میرا خیال ہے کہ اردو ادب سے تنقید کو نکالنے کی بجائے نقاد کو نکال دینا زیادہ مفید رہے گا۔ نہ بجے گا بانس نہ رہے گی بانسری۔" (محاورے کی الٹ پھیر پر خاص طور سے غور فرمائیں کہ اس سے مفہوم کتنا بلیغ و عمیق ہو گیا ہے)۔

یہاں اہل نظر اعتراض کر سکتے ہیں کہ تنقید بالکل نہ رہی تو تخلیق کی قدر و قیمت کا اندازہ کیسے ہو گا؟ تخلیق کار کو بہتر سے بہتر تخلیق کی ترغیب و تحریک کیسے ملے گی؟

تو جواب اس کا یہ ہے جناب کہ جب نقاد سامنے سے ہٹ جائے گا تو تخلیق اپنے آپ بہتر ہو جائے گی۔ ہم تنقید کے دشمن نہیں، تنقید بازی کے خلاف ہیں۔ تخلیق اور تنقید میں بہ لحاظ کمیت ایک معقول تناسب چاہتے ہیں۔ یہ نہیں چاہتے کہ نقادوں کی تو فوج کی فوج تیار ہو جائے اور تخلیق کار ڈھونڈے نہ ملیں۔

مشکل یہ ہے کہ تعلیمی کمر شیلزم نے تنقید کو تخلیق سے زیادہ اہم بنا دیا ہے۔ ڈاکٹر اور پروفیسر کو فنکار سے بڑا رتبہ دے دیا گیا ہے۔ آج ایک عمدہ غزل کہنے والے کو وقتی واہ واہ اور مکرر ارشاد میں ٹرخا دیا

جاتا ہے۔ اچھا افسانہ لکھنے والے کو اپنے پیدا ہونے کی اطلاع دینے میں برسوں لگ جاتے ہیں جب کہ اس عمدہ غزل اور اچھے افسانے میں جوئیں اور لیکیں ڈھونڈنے والے نقاد کو فوراً ادب کا ڈاکٹر مان لیا جاتا ہے۔ اکادمیاں اسے ایوارڈ دیتی ہیں۔ ادبی جریدے اس پر اپنا خاص نمبر نکالتے ہیں اور دوردرشن خصوصی پروگرام نشر کردیتا ہے۔

اور اس چکاچوند سے دور اندھیرے میں بیٹھا ہوا فن کار اور تخلیق کار جب منڈی ہاؤس جاکر کہتا ہے کہ جناب دوردرشن کی بزم میں تھوڑی سی جگہ مجھے بھی دے دیجئے کہ فلاں نقاد میری تخلیق کی چیرپھاڑ کے بعد ہی ڈاکٹر بنا ہے تو افسر اس سے پوچھتا ہے۔۔۔"فلاں ڈاکٹر کا فٹ نس سرٹیفکیٹ لائے ہیں آپ؟"

ایک روز میاں عبدالقدوس تنقید پر وعظ دے رہے تھے۔

"ہمارے چاروں طرف اتنے ادبی ڈاکٹر پیدا ہوگئے ہیں کہ بے چارا ادب بیمار پڑگیا ہے۔ جدھر جاتا ہے ادھر ایک نقاد راستے میں کھڑا ملتا ہے۔ یہاں تک کہ سڑک پر پڑی ہوئی کوئی اینٹ اٹھاؤ تو اس کے نیچے بھی کوئی نقاد موجود ہوگا جو اینٹ کے بنتے ہی کہے گا' جناب مجھے اس بارے میں کافکا کی رائے سے قطعی اتفاق نہیں جو اس نے بالزاک پر روسو کی رائی سے سارترے کے اختلاف کے حق میں دی تھی۔"

"کیا بات ہے۔ سبحان اللہ۔" ہم داد دیئے بغیر نہ رہ سکے۔

"ٹوکو مت۔ آج میں سنجیدہ موڈ میں ہوں اور سنجیدگی سے کچھ سنجیدہ باتیں کہنا چاہتا ہوں۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ ہمارے نقادوں کی تنقیدیں پڑھتا کون ہے؟ یہ لوگ اچھی تنقید کیوں نہیں کرتے؟"

"اچھی تنقید کیسی ہوتی ہے؟ یہ بھی بتادیجئے۔" ہم نے سوال کیا۔

"اچھی تنقید وہ ہوتی ہے جس میں تھوڑی سی نطوئے انصاریت ہو۔"

"یعنی؟"

"یعنی لہجے میں شگفتگی' بیان میں شگفتگی اور فکر میں شگفتگی۔ ایسی تنقید جس میں تخلیق کا حسن اور مزہ ہو۔ یاد رکھو شگفتگی سے لکھی گئی شگفتہ تنقیدیں بے حد شگفتہ ہوتی ہیں جن کے مطالعہ سے دل و دماغ میں شگفتگی پیدا ہوتی ہے۔"

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ تنقید کے پیمانے بھی آپ وہی رکھنا چاہتے ہیں جو تخلیق کے ہیں!؟"

"بے شک!" انہوں نے مغل اعظم پر تھوری راج کپور کے انداز میں کہا اور تخلیہ کے لیے ہاتھ ہلا دیے۔

میاں عبدالقدوس کے بقول اردو ادب میں دو کام سب سے آسان ہیں اور دوسرا کام ہے تنقید!

ایک روز ہم نے پوچھا۔ ''اور پہلا کام کیا ہے؟''

کہنے لگے۔ ''پہلا بھی تنقید ہے۔''

''وہ کیسے؟'' ہم نے پوچھا۔

''وہ ایسے کہ تمہیں اردو میں ادیب کم نقاد زیادہ ملیں گے۔ بلکہ ادیبوں میں بھی دیکھو گے تو ہر دوسرا ادیب تیسرے پر اور تیسرا چوتھے پر تنقید کرتا ہوا ملے گا۔''

''معاف کیجئے خاں صاحب آپ کے اس خیال سے ہمیں اختلاف ہے۔ اول تو یہ کہ نقاد بھی ایک ادیب ہوتا ہے۔ اسے آپ ادیب کیوں نہیں مانتے۔ دوسرے یہ کہ موصولہ اطلاعات کے مطابق اردو میں سب سے آسان کام شاعری ہے۔ اردو میں آپ کو ہر پہلا دوسرا تیسرا اور چوتھا آدمی شاعری کرتا ہوا ملے گا۔ حالت یہ ہے کہ دس دس بارہ بارہ سال کے بچے تختی پر الف بے تے لکھنا سیکھتے ہی ردیف اور قافیہ ڈھونڈنے لگتے ہیں۔ لب پہ آتی ہے دعا بعد میں یاد کرتے ہیں' دل ناداں تجھے ہوا کیا ہے کی گردان پہلے شروع ہو جاتی ہے۔ کسی بھی شہر میں چلے جائیے' پوری اردو قوم آپ کو شعروشاعری میں گرفتار ملے گی۔ بلکہ بعض لوگ تو آپ کو ایسے بھی مل جائیں گے جو اردو لکھنا پڑھنا بعد میں سیکھتے ہیں شاعری پہلے شروع کر دیتے ہیں۔''

خاں صاحب چپ چاپ یہ باتیں سنتے رہے۔ بلکہ جب ہم چپ ہو گئے تب بھی کچھ دیر خاموش رہے۔ پھر بولے۔

''کہہ چکے؟ یا ابھی کچھ باقی ہے؟''

''جی نہیں۔'' میں نے کہا۔ ''اب آپ ارشاد کیجئے۔''

''تو سنو! جہاں تک شعروشاعری کا تعلق ہے تو اردو ہے ہی شاعری کی زبان۔ جو بھی اس زبان کو صحیح تلفظ کے ساتھ بولتا ہے اور اسی طرح صحیح تلفظ سے اردو میں سوچنے لگتا ہے تو نہ چاہتے ہوئے بھی شاعر ہو جاتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اردو جیسی شاعرانہ زبان بولنے والا آدمی شاعری نہیں کرے گا تو کیا چھولے بھورے بیچے گا؟''

''واہ۔ یہ چھوٹے بھورے کی بھی خوب رہی! بھلا چھوٹے بھورے کی ہی مثال کیوں؟'' ہم نے چھیڑا۔

''اس لیے کہ مجھے تم اگر دہلی شہر میں چھولے بھورے بیچنے والا ایک بھی ایسا آدمی دکھادو جو اردو کا صرف ایک جملہ درست تلفظ کے ساتھ بول دے تو میری طرف سے تمہیں پورے ہفتے کالی مسجد کی دکان پر نہاری کھانے کی دعوت ہے!''

''آپ ٹھیک کہتے ہیں خاں صاحب!'' ہمیں ماننا پڑا۔ ''کاش ہم یہ لذیذ شرط جیت سکتے!''

"اب رہی تنقید کرنے والے کو ادیب کہنے کی بات تو چلو ہم مان لیتے ہیں کہ نقاد بھی ایک طرح کا ادیب ہوتا ہے۔ مگر میری بات تب بھی غلط نہیں ہوگی بلکہ تب تو میں اور بھی وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اردو کا ہر ادیب تنقید کرتا رہتا ہے اور یہی اردو ادب میں سب سے آسان کام ہے۔ یہاں تک کہ اگر چاہو تو تم بھی نقاد بن سکتے ہو!"

"ہم! وہ کیسے؟"

"ساری باتیں کیا آج ہی پوچھ لوگے۔ فی الحال تم میرے ساتھ چلو۔ آج کابل تمہیں ہی ادا کرنا ہے۔" انہوں نے ایک تھری وہیلر کو اشارے سے روکتے ہوئے کہا۔

"چلئے۔ بسم اللہ۔ لیکن چلنا کہاں ہے؟"

"کالی مسجد۔" انہوں نے کہا اور اچک کر اسکوٹر رکشہ میں بیٹھ گئے۔

کالی مسجد کی دکان پر تین پلیٹ نہاری نوش فرمانے کے بعد میاں عبدالقدوس نے اللہ میاں کی حمد میں ایک ڈکارلی اور نقاد بننے کے گر سیکھنے کے لیے اگلی صبح آنے کا وقت دے دیا۔

وقت مقررہ پر ہم ان کی بیٹھک میں پہنچے تو وہاں بھی نہاری موجود تھی اور پایوں کے شوربے کی قاب ان کا انتظار کر رہی تھی۔ نہاری سے فارغ ہو کر انہوں نے اس قاب سے انصاف کیا اور پھر ایک نلی آنکھ کے قریب لا کر اس طرح آر پار دیکھنے لگے جس طرح شکاری اپنی بندوق صاف کرتے وقت اس کی نال میں جھانکتا ہے' یا ستارہ شناس دوربین سے آسمان کو دیکھتا ہے۔ تمام نلیوں کی صفائی اور بغور معائینے سے فارغ ہو کر انہوں نے ہاتھ منہ اور دانت صاف کیے اور پھر احتیاطاً" آخری نلی میں جھانکنے لگے کہ کہیں کچھ باقی تو نہیں رہ گیا ہے۔ تبھی اس نلی کے اندر سے ہمیں دیکھ کر حیرت سے بولے۔

"ارے!؟ یہ تم ہو۔ میں سمجھا تھا بندو حقہ تازہ کر کے رکھ گیا ہے۔ کمبخت نلی پائے اچھے بناتا ہے۔ پہلے آجاتے تو تم بھی شریک ہو جاتے۔ خیر دیر آید درست آید۔ سناؤ' کیسے آنا ہوا۔ گھر میں تو سب خیریت ہے نا!"

ہم ان کے بھلکڑ پن سے بخوبی واقف تھے' اس لیے فوراً اپنے آنے کا مقصد بیان کر دیا اور خاں صاحب بھی سنتے ہی اپنی جون میں واپس آ گئے۔

"دیکھو میاں۔ نقاد بننا بے حد آسان ہے۔ لوگ تنقید نگاری کو سب سے مشکل کام مانتے ہیں۔ نقاد بننے کے لیے بڑی بڑی ڈگریاں حاصل کرتے ہیں۔ تحقیقی مطالعے کا ڈرامہ کرتے ہیں۔ فلسفے کی کتابوں کا گھوٹا لگاتے ہیں۔ کسی بڑے نقاد کی مصاحبی میں لگے رہتے ہیں۔ اس کی اصلاح اور سفارش سے دس بارہ مضمون ایسے ادبی ماہناموں میں شائع کراتے ہیں جو سال میں صرف ایک مرتبہ چھپتے ہوں۔ پھر دہلی اردو اکادمی کے جزوی اور پیشہ ور اردو پبلشر کے کلی تعاون سے ان درجن بھر مضامین سے بارہ عدد مضامین چن

کراور اسمیں منتخب مضامین کمہ کر ایک انتخاب چھاپتے ہیں جس کی قیمت ڈیڑھ سو روپے ہوتی ہے۔ اس کے بعد رسم اجراء کا جلسہ ہوتا ہے' ڈیڑھ سو روپے کی کتاب مفت تقسیم کی جاتی ہے۔ سال بھر بعد اس پر دو چار ریویو چھپتے ہیں۔ مزید ایک سال بعد دوردرشن کی "بزم" میں تنقید کی اس تازہ ترین کتاب پر چار پانچ ڈاکٹر حضرات ساڑھے تین منٹ کی جامع اور سیر حاصل بحث کرتے ہیں تب کہیں جاکر آدمی چھوٹا موٹا نقاد بن پاتا ہے۔"

"واقعی! آپ درست فرمارہے ہیں۔" ہم نے تائید کی۔

"لیکن میری رائے میں نقاد بننے کی لیے اتنا اودھم مچانے کی قطعی ضرورت نہیں ہے۔ آدمی چاہے تو صرف ایک دن میں نقاد بن سکتا ہے۔ بس اسے یہ یاد رکھنا چاہیے کہ نقاد بننا آسان ہے اور بڑا نقاد بننا اس سے بھی زیادہ آسان ہے!"

"وہ کیسے؟"

"اسے بس ایک درجن مغربی نقادوں اور ادیبوں کے نام اور اردو کے دو درجن ثقیل الفاظ یاد کرنے ہوں گے۔"

"مثلاً؟"

"مثلاً کامو' سارترے' موپاساں' برٹرینڈ رسل' برنارڈشا' دوستوفسکی' ایلیٹ' دانتے' کانٹ' نٹشے' ملٹن' کافکا اور کازان وغیرہ۔ اگر یہ نام یاد نہ ہوں تو مغربی ملکوں کے عام شہریوں کے نام بھی چل سکتے ہیں۔ مثلاً آرتھر' جیمس' اسمتھ' لوئس وغیرہ۔"

"لیکن ان مغربی ناموں کا تنقید سے کیا تعلق ہے۔" ہم الجھ گئے۔

"تعلق بڑا سیدھا اور صاف ہے۔ نقاد کو کبھی کوئی بات حوالے کے بغیر نہیں کہنی چاہیے۔ ورنہ اس کی بات پر کوئی یقین نہیں کرے گا۔ اس کا احساس اردو کے ہر نقاد کو رہتا ہے۔ چنانچہ وہ مغربی ادیبوں کے حوالے کے بغیر کبھی کوئی بات نہیں کہتا۔ یہی سبب ہے کہ اردو میں اب ایسا کوئی نقاد نہیں گذر رہا ہے جس کا حوالہ دیا جاسکے۔ ہمارے تمام نقاد دوسروں کے حوالے سے جی رہے ہیں۔"

"چلئے یہ تو نام ہوگئے۔ اب ثقیل الفاظ بتایئے۔" ہم نے کہا۔۔۔

"وہ بھی اپنی مرضی سے چنے جاسکتے ہیں۔ مثلاً شعور' ادراک' عرفان ذات' مابعد الطبعیات' عصری حسیت' اساسی جبلت' سطحیت' غیر سطحیت' معروضیت' آفاقیت اور دوسرے بہت سے الفاظ جن کے آخر میں ت آتی ہو۔ تنقید میں ان لفظوں کا بار بار استعمال بے حد ضروری ہے۔"

"مگر کیوں؟" ہم پھر الجھ گئے۔

"اس لیے کہ اگر ان لفظوں کا کثرت سے استعمال نہ کیا گیا تو تنقید سمجھ میں آجائے گی اور جس کی

تنقید سمجھ میں آجائے اس کا نقاد بننا مشکل ہے۔ تنقید سمجھنے میں جتنی مشکل ہوگی نقاد درجہ میں اتنا ہی بڑا ہوگا۔ احتیاطاً میں اپنا قول دوہراتا ہوں۔ نقاد بننا آسان اور بڑا نقاد بننا اور بھی آسان ہے!''

یہ تو تھا تنقید کا احوال۔ اب ذرا تحقیق کی طرف آیئے۔ ہمارے خیال سے ادبی تحقیق' ادبی تنقید سے بھی زیادہ آسان کام ہے۔ اتنا آسان کہ اس پر روشنی ڈالنے کے لئے میاں عبدالقدوس کی بجائے ان کے نوکر بندو میاں کا حوالہ دینا ہی کافی ہے۔

ایک روز ہم انہیں بازار میں دیکھ کر حیران رہ گئے۔ عام طور سے بندو میاں کے ہاتھوں میں سبزی سے بھرا تھیلا ہوتا تھا۔ مگر اس روز وہ کتابوں سے لدے پھندے تھے۔

''خیریت تو ہے بندو میاں۔ آج کیا خاں صاحب نے سبزی کی بجائے کتابیں گوشت میں ڈالنے کو کہہ دیا ہے۔'' ہم نے مذاق میں کہا۔

بندو میاں شرما گئے۔ بولے ''نہیں جی۔ بھائی میاں تو شہر سے باہر گئے ہیں کچھ دنوں کے لیے۔ یہ کتابیں دراصل میں اپنے واسطے لایا ہوں شیخ یا مین اینڈ سنز سے۔''

یہ تو ہم جانتے تھے کہ بندو میاں کو پڑھنے کا بڑا شوق ہے اور ابن صفی اور اکرم الہ آبادی کے ناول پڑھ پڑھ کر وہ خاصے عقلمند ہوگئے ہیں۔ لیکن اتنی ساری کتابوں کے ساتھ وہ پہلی مرتبہ دکھائی دیئے تھے۔ اور کتابیں بھی کون سی؟ جدلیاتی مادیت' مبادیات فلسفہ' مابعد الطبیاتی نفسیات' قصہ طوطا مینا و گل بکاؤلی کا تقابلی مطالعہ' اکبر بیربل کے لطیفے' سائیکل مرمت گائڈ بالتصویر' محمد رفیع اور مکیش کے سدا بہار گانے رشیدہ کی کشیدہ کاری اور نہ جانے کیا کیا۔

''ان کتابوں کا کیا کریں گے آپ؟'' ہم نے ان کے ساتھ خاں صاحب کے گھر آکر پوچھا۔

''کچھ نہیں۔ بس ایسے ہی۔'' بندو میاں پھر شرما گئے اور پھر جیسے انہوں نے بم کا گولہ چھوڑ دیا۔ اچانک بولے۔ ''آج کل میں ادب پر تحقیق کر رہا ہوں۔''

''تحقیق؟ خدا کی پناہ۔ خاں صاحب سے یہ بیماری تمہیں بھی لگ گئی؟'' ہم نے کہا۔

''نہیں نہیں۔ وہ بات نہیں۔ میں تو ڈگری کے لئے کر رہا ہوں۔ آج کل خالی تھا۔ سوچا کچھ تحقیق ہی کرلوں۔ سنا ہے تحقیق کرنے والے کو ادب کے ڈاکٹر کی ڈگری مل جاتی ہے۔''

''مگر اس ڈگری کا کروگے کیا''؟

''کرنا کیا ہے۔ بھائی میاں سے کچھ رقم لے کر اچھا سا کلینک کھول لوں گا اور پھر خدا نے چاہا تو ایک نرسنگ ہوم بھی۔ سوچتا ہوں اس سلسلے میں ڈاکٹر قمر رئیس اور ڈاکٹر ساغر اعظمی سے مشورہ کرلوں۔ سنا ہے ان کی پریکٹس اچھی چل رہی ہے۔''

''الٰہی خیر۔ تم نے تو یار سب کو ایک بھاؤ تول دیا اور پھر تحقیق ہی کرنی ہے تو کتابوں کی کیا ضرورت

ہے۔ ڈگری والی تحقیق کتابوں سے ہوتی ہے میرے بھائی۔ موضوع سے ہوتی ہے، جس پر کسی اور نے تحقیق نہ کی ہو۔ پہلے کوئی اچھوتا موضوع سوچ کر رجسٹریشن کراؤ پھر تحقیق کی بات کرو۔"

بندو میاں سوچ میں پڑ گئے۔ کچھ دیر تک سر ہلا ہلا کر سوچتے رہے۔ پھر اچانک بولے۔ "سوچ لیا۔ قصہ طوطا مینا اور اردو ادب! یہ موضوع کیسا رہے گا۔"

"بہت خوب۔ خاں صاحب کی صحبت رنگ لا رہی ہے۔ تم ضرور ان کا نام روشن کرو گے۔"

"آپ تو شرمندہ کر رہے ہیں۔ ویسے میرے ذہن میں اور بھی کئی موضوع ہیں جن پر تحقیق ہو سکتی ہے۔"

"مثلاً؟" ہم نے پوچھا۔

"مثلاً اکبر بیربل کے لطیفوں میں لطیفہ بازی، سائیکل اور جدید معاشرہ، قصہ گل، بکاؤلی کا مابعد الطبیاتی جائزہ، ہماری شاعری اور کشیدہ کاری اور رشیدہ کاری پر کشیدہ کاری کے اثرات وغیرہ وغیرہ۔"

"کیا بات ہے۔ کافی اونچے جا رہے ہو۔ میرے عزیز، ان موضوعات پر صرف دلیپ سنگھ اور مجتبیٰ حسین جیسے مزاح نگار ہی تحقیق کر سکتے ہیں۔ تم کوئی سنجیدہ سا موضوع سوچو جو سننے میں بھی سنجیدہ سا لگے۔"

"دو سنجیدہ موضوع بھی ہیں میرے پاس۔" بندو میاں کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

"بتاؤ۔"

"جدلیاتی مادیت اور مادی جدلیات۔"

"خدا خیر کرے۔ یہ ایسے موضوع ہیں کہ بچہ کیا بڑا بھی سنے تو ڈر جائے۔"

"تو پھر ایک اور موضوع ہے۔ مجھے مولانا حالی بہت پسند ہیں۔"

"یہ موضوع ہے؟" ہم نے دریافت کیا۔

"نہیں۔ وہ تو میں کہہ رہا ہوں کہ مجھے مولانا حالی بہت پسند ہیں۔ بڑے شریف آدمی تھے بیچارے۔ صورت سے بھی شریف معلوم ہوتے تھے۔ موضوع یہ ہو سکتا ہے کہ.... کہ... کہ.... ہاں، مولانا حالی اور حالیہ شاعری!"

"سبحان اللہ! یہ ایسا موضوع ہے کہ مولانا حالی نے تو شاعری پر مقدمہ چلایا تھا۔ شاعر حضرات تم پر مقدمہ ٹھوک دیں گے!"

یہ سن کر افسوس سے بندو میاں کا منہ لٹک گیا۔ پھر اداس لہجے میں سرد آہ بھر کر بولے۔ "اگر یہ سارے موضوع غلط ہیں تو پھر ایک ہی موضوع باقی رہ جاتی ہے۔"

"کیا؟" ہم نے پوچھا۔

"یہ منہ اور مسور کی دال" انہوں نے کہا اور اپنے مستقل علاقے یعنی میاں عبدالقدوس کے باورچی خانہ میں غائب ہو گئے۔

اس واقعے کے چند ہفتے بعد ایک روز شام کا کھانا بنانے کے لیے باورچی خانہ میں داخل ہونے سے پہلے بندو میاں نے اعلان کیا۔

"الحمدللہ! بعد از تحقیق بسیار، یہ امر پایہ ثبوت کو پہنچا کہ اردو ادب میں سب سے اعلیٰ اردو ادب کتابوں، رسالوں اور اخبارات میں نہیں بلکہ ٹرکوں پر تحریر ہوا ہے۔"

چونکہ اس وقت میاں عبدالقدوس گھر میں نہیں تھے اس لیے اعلان بہ آواز بلند کیا گیا تھا اور بندو میاں کے واحد سامع ظاہر ہے کہ ہم تھے۔

"ٹرکوں، یعنی ٹرک کی جمع؟" ہم نے احتیاطاً پوچھا۔

"جی ہاں چلنے والے ٹرک۔ سامان ڈھونڈنے والے ٹرک۔ اردو میں سب سے اچھی شاعری ان ہی پر ہوئی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ فرمایئے۔"

"ارشاد"۔

"شعر ہے کہ مدعی لاکھ برا چاہے تو کیا ہوتا ہے۔ وہی ہوتا ہے جو منظور خدا ہوتا ہے۔"

"بہت خوب۔"

"فانوس بن کے جس کی حفاظت ہوا کرے۔"

"ہوا نہیں ہوا۔ چلنے والی ہوا۔" ہم نے تصحیح کی۔

"اوہ معاف کیجئے۔ ذرا بولنے میں کتابت کی غلطی ہو گئی۔ بہرحال۔ شعر ہے کہ فانوس بن کے جس کی حفاظت ہوا کرے۔ وہ ٹرک کیا رکے جسے اسٹارٹ اللہ رکھا کرے۔"

"دوسرے مصرعے کا وزن زیادہ ہے۔ بحر سے خارج ہے۔" ہم نے کہا۔

"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ چنگی انسپکٹر کا بھی یہی خیال تھا۔ چنانچہ اس نے ڈرائیور محمد دین عرف اللہ رکھا کا چالان کر دیا اور تنبیہہ کی کہ خبردار آئندہ کاغذات میں پورا وزن درج ہونا چاہیے۔ یہ نہیں کہ کاغذات میں لکھا پچاس کوئنٹل اور ٹرک پر لاد لیا پچاس کوئنٹل دو سو گرام!"

"مگر میں شعر کے وزن کی بات کر رہا تھا۔ ٹرک کے وزن کی نہیں۔" ہم نے یاد دلایا۔

"میں آپ کی بات سمجھ رہا ہوں بھائی میاں۔ اور محمد دین کو بھی میں نے سمجھایا تھا کہ میاں ٹرک اور شعر کا وزن درست رکھا کرو، آخر آدمی کو دین و آخرت کا بھی کچھ خیال رکھنا چاہیے۔ مگر اس نے دھیان نہیں دیا۔ نتیجہ یہ کہ پکڑا گیا۔ خیر اب سنا ہے کہ سدھر گیا ہے۔ ایک دن کہنے لگا کہ میں نے ٹرک

اسکائی گروپ

جملہ حقوق غیر محفوظ

BA-QALAM KHUD

BY

NUSRAT ZAHEER
4/15, KHICHRIPUR COLONY
DELHI - 110 091

مصنف کی دیگر حماقتیں

○ تحت اللفظ (1992)
○ ابن بطوطہ کا دوسرا سفر (1993)

تعداد	: 1100
اشاعت	: نومبر 1996
زیر اہتمام	: شفیق الحسن
سرورق	: ایم ثاقب
خطاطی	: جلال الدین اسلم
کمپیوٹر کمپوزنگ	: "اخبار نوجواں" کمپیوٹر سیکشن، عقب تیج پریس، بہادر شاہ ظفر مارگ نئی دہلی-2
طابع	: چمن انٹرپرائزز، پٹودی ہاؤس، دریاگنج نئی دہلی-2
ناشر	: اسکائی گروپ-167/7، جولینا کمرشل کمپلیکس، نئی دہلی-110025
قیمت (مجلد)	: 200 روپے

کے آگے اور پیچھے ایک اور شعر لکھوادیا ہے جو میں نے خود ہی کہا ہے۔ انشاء اللہ اب کبھی چالان نہیں ہوگا۔ شعر یہ ہے کہ۔ مت الجھنا محمد دین سے ٹرک ہے اس کا اعلیٰ۔ او بری نظر والے تیرا منہ ہو کالا۔ ساتھ ہی ایک پھٹا پرانا جوتا بھی شعر کے ساتھ لٹکادیا ہے تاکہ کسی مصرعے میں وزن کم ہو تو پورا ہو جائے۔"

"کیا بات ہے! محمد دین تو تم سے بھی آگے کی چیز معلوم ہوتا ہے۔" ہم داد دیئے بغیر نہ رہ سکے۔

"کچھ اور شعر بھی ہیں جن سے اردو ادب ٹرکوں کی بدولت ہی روشناس ہوا ہے۔ مثلاً ایک ٹرک نے کہا ہے' رات تو رات ہے اب دن کو بھی آرام نہیں۔ وہ مسافر ہوں مری صبح کہیں شام کہیں۔ یا یہ شعر ہے کہ میں کہاں رکتا ہوں عرش و فرش کی فریاد سے۔ مجھ کو جانا ہے بہت آگے مراد آباد سے۔ ایک اور ٹرک کہتا ہے۔ ہٹ جاؤ بستی والو آیا ٹرک ہمارا۔ حافظ خدا تمہارا حافظ خدا تمہارا۔ اتفاق سے اس ٹرک کا بریک فیل اور ہارن خراب ہے۔ ایک ٹرک نے تو میاں حد ہی کردی۔ کہتا ہے۔ اے ٹائر لا ہوتی اس ٹیوب سے موت اچھی۔ جس ٹیوب سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی۔ اس ٹرک کا دوسرا شعر یہ ہے۔ تو' جو جھکے تو کچھ نہ ہو' میں جو جھکوں خبر بنے۔ تیری نماز اور ہے میری نماز اور ہے!"

"بہت خوب!"

"یہ تو ہے شاعری۔ دوسرا پہلو ترسیل کا ہے جو آج کے ادب کا سب سے اہم مسئلہ ہے۔ اور آپ تو جانتے ہیں کہ ٹرک کا تو کام ہی ترسیل ہے۔ ترسیل میں آج کا ٹرک آج کے شاعر سے میلوں آگے ہے۔ ہمارے ٹرک جموں کی شاعری کو کنیا کماری اور کلکتہ کے ادب کو بمبئی تک پہنچادیتے ہیں اور وہ بھی رات کو ڈیزل کا استعمال کیے بغیر۔ بس ان ہی باتوں کو جوڑ جاڑ کر ٹرک اور اردو ادب کے موضوع پر ایک تحقیقی مقالہ سپرد قلم کردیا ہے۔ آگے اللہ مالک ہے!"

"کیا کہنے ہیں۔ تم ضرور تحقیقی ادب میں اپنا نام روشن کروگے۔" ہم نے کہا۔

"مگر ایک بات کا مجھے بڑا افسوس ہے بھائی میاں!"

"وہ کیا؟"

"یہ کہ ادب کی اتنی خدمت کے باوجود اردو اکادمیوں نے آج تک کسی ٹرک کو ادبی ایوارڈ نہیں دیا جب کہ ناکارہ اور کھٹارہ پھکڑے اعزازات سے لدے پھندے پھر رہے ہیں۔"

☆ ☆ ☆

ایک یادگار استقبالیہ

پچھلے دنوں ایک اردو اکادمی کی طرف سے برصغیر کے ادیبوں کو ایسا یادگار استقبالیہ دیا گیا جسے ادبی وغیرادبی حلقوں میں عرصہ تک یاد رکھا جائے گا۔

استقبالیہ اتنا سبق آموز اور عبرت آمیز تھا کہ بقول میاں عبدالقدوس کم از کم اس صدی میں تو اردو کا کوئی ادیب دہلی میں ایسا استقبال کرانے کی ہمت نہیں کر سکے گا۔

"صدی نہیں عشرہ کہئے۔ اب تو اس صدی میں پانچ چھ سال ہی باقی رہ گئے ہیں۔" ہم نے تصحیح کی کوشش کی۔

"ایک ہی بات ہے' صدی کہو یا عشرہ! اگلے برسوں میں جو کچھ ہوگا اور جو کچھ نہیں ہوگا اس کا کریڈٹ اس عشرے کو نہیں پوری صدی کو ملے گا۔" انہوں نے کہا اور ہم ہمیشہ کی طرح اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔

عزیزو! مشکل یہ ہے کہ دلی میں دل تو بڑے مل جاتے مگر جگہ کی ہر جگہ اتنی تنگی ہے کہ اس میں آدمی کی سمائی مشکل ہے۔ چنانچہ استقبالیہ کی تقریب میں جو کچھ ہوا وہ اسی تنگی جگہ کا نتیجہ تھا جو منتظمین کی کشادہ دلی کے نتیجہ میں نتیجہ کے طور پر پیدا ہوئی تھی۔ اور ہم نے یہ نتیجہ اس لیے نہیں بھگتا کہ ہمارا استقبال ہو رہا تھا۔ بفضل ربی ہمارا شمار نہ کبھی ایسے ادیبوں میں ہوا نہ انشاء اللہ کبھی ہوگا جن کا استقبال ضروری ہے۔ ہم تو خیر سے ان میں شامل ہیں جو نہ تین میں ہوتے ہیں نہ تیرہ میں۔ یعنی حاضرین' ناظرین' سامعین' قارئین اور مدعوئین وغیرہ!

استقبالیہ میں جس وقت ہم پہنچے تو وہ مختصر کانفرنس ہال لگ بھگ پوری طرح بھر چکا تھا جہاں پروگرام

رکھا گیا تھا۔ خوش قسمتی سے ایک کونے میں اسٹول پر رکھے بڑے سے گلدان کے قریب ایک کرسی خالی دکھائی دے گئی۔ ہم تیزی سے اس طرف لپکے اور جیسے ہی کرسی کے قریب پہنچے میاں عبدالقدوس نے فوراً اس پر قبضہ جمالیا اور ہمیں گلدان ہٹاکر اسٹول پر رکھ دیا۔

ایک منتظم سے ہم نے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ کن کن ادیبوں کا استقبال ہو رہا ہے اور وہ کہاں کہاں بیٹھے ہیں۔ اس نے یہ بتاکر حیرت میں ڈال دیا کہ ہال جن لوگوں سے بھرا ہوا ہے وہ سب استقبال کرنے والے ہیں اور جن کا استقبال ہونا ہے ان کے آنے میں پندرہ منٹ باقی ہیں!

"یااللہ! استقبال والے ادیب کہاں بیٹھیں گے؟" ہم بہ آواز بلند سوچنے لگے اور میاں عبدالقدوس نے منہ پر انگلی رکھ کر ہمیں "ششش" کردیا۔

اگلے پندرہ منٹوں میں بیس اشخاص اور اندر آگئے۔ لیکن وہ سب بھی استقبال کرنے والے ہی تھے۔ یعنی میزبان آگئے تھے اور مہمانوں کا انتظار تھا۔

"کافی بھیڑ ہوگئی ہے۔" ہم نے رومال سے پنکھے کا کام لینے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں!" خاں صاحب نے تصدیق کی۔ "ہال اور چھوٹا ہوتا تو اور زیادہ بھیڑ ہوتی۔"

"ذرا وضاحت فرمایئے۔" ہم نے کہا۔

"مطلب کہنے کا یہ ہے کہ ہال مزید چھوٹا ہوتا تو اس میں موجود حاضرین کافی مکعب انچ تناسب اور زیادہ ہوتا۔"

تبھی کھچا کھچ بھرے ہوئے ہال میں ہلچل مچ گئی۔ داخلی دروازے پر ہٹو بچو کا شور ہونے لگا۔ معلوم ہوا کہ جن ادیبوں کا استقبال کے لیے استعمال ہونا تھا وہ آگئے تھے اور یہ ان ہی کی آمد کا غلغلہ تھا۔ سب لوگ اپنی اپنی سیٹوں پر جم کر بیٹھ گئے کہ کسی زیر استقبال ادیب کو بٹھانے کے لیے کوئی ان سے کرسی نہ خالی کرالے۔

تقریباً دو درجن اردو ادیبوں کا استقبال ہونا تھا جن میں ایک خوبصورت روسی خاتون بھی شامل تھیں۔ انھیں دیکھ کر کئی لوگ کرسیوں کی حدود میں پہلو بدلنے لگے۔

سب ادیبوں کو ایک ایک کرکے کسی نہ کسی طرح ہال میں ٹرانزٹ کیا گیا اور بے چارے ادیب خفیف و شرمسار سے ہوکر جہاں بھی ممکن تھا وہاں پھنس گئے یا اٹک گئے۔

لیکن روسی خاتون ابھی باقی تھیں!

انہوں نے جھجکتے ہوئے قدم آگے بڑھائے تو مجمع کائی کی طرح پھٹتا چلا گیا۔ کئی جگہ اس کائی نے دوبارہ جڑنے کی کوشش کی۔ لیکن روسی خاتون ہوشیار تھیں۔ وہ کسی ماہر "بیلے رینا" کی طرح بڑی صفائی سے پھٹی ہوئی کائی پار کر گئیں اور ایک سرسفید بزرگ کی کرسی کی نسبتاً محفوظ بغل میں پارک ہوگئیں۔

تقریباً سبھی زیرِ استقبال ادیب اندر آچکے تھے اور پورا ہال جامع مسجد سے سیلم پور جانے والی ڈی ٹی سی بس میں تبدیل ہو چکا تھا۔ فرق بس اتنا تھا کہ ڈی ٹی سی کی بس میں پکڑنے کے لیے ڈنڈے بھی ہوتے ہیں۔ کھچا کھچ ہال میں اب سب لوگ اس بری طرح ایک دوسرے سے سٹ کر بیٹھے اور کھڑے تھے کہ ہلنے تک کی گنجائش نہیں تھی۔ یہاں تک کہ ایک صاحب نے جماہی لی تو جماہی کی واپسی میں دوسرے صاحب کی ناک اور تیسرے کا کان ان کے دانتوں میں آتے آتے رہ گیا۔

اب جلسے کی کارروائی شروع ہونے والی تھی۔ کئی لوگ ناظم جلسہ کو اپنی اپنی جگہ کھڑے کھڑے ڈھونڈ رہے تھے جو کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

اسی دوران ایک لحیم شحیم ادیب کی بغل میں کچھ حرکت پیدا ہوئی اور حرکت کے بعد اس میں سے ایک گردن نمودار ہوئی جس نے اعلان کیا۔۔۔

"صاحبو! میں ہی ناظم جلسہ ہوں۔"

یہ اکادمی کے سکریٹری تھے۔ انہوں نے بڑے شستہ اور شائستہ لہجے میں تمام شرکائے جلسہ سے اس بدنظمی اور استقبال' دونوں کے لیے اتنا مختصر ہال چننے کی معذرت چاہی اور گذارش کی کہ تنگی جگہ کی وجہ سے جو لوگ جونیئر اور کم عمر ہیں وہ ہندستانی روایات کا خیال رکھتے ہوئے اپنی نشستوں سے اٹھ کر' اپنے بزرگوں کو جگہ دے دیں تو بدنظمی بڑی حد تک دور ہو جائے۔

اس دردمندانہ اپیل کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ جو لوگ بیٹھے تھے وہ اپنی کرسیوں پر پہلے سے زیادہ جم کر بیٹھ گئے اور جو کھڑے تھے وہ بیٹھے ہوؤں کو غور سے گھور گھور کر ان کی عمروں کا اندازہ لگانے لگے۔

تاہم ایک دو شریف الطبع نوجوان احتراماً" اپنی کرسیوں سے اٹھ گئے اور وہاں اتنے ہی بزرگ ادیبوں کو جگہ مل گئی۔ یہ دیکھ کر ایک بزرگ خاتون اچانک اپنی کرسی سے اٹھ گئیں اور اس پر ایک نسبتاً" کم عمر ادیبہ کو بیٹھنے کا اشارہ کرنے لگیں۔ لیکن موخرالذکر نے اس پر اظہار تشکر کی بجائے بے رخی سے رخ پھیر لیا۔

"یہ کیا بات ہوئی خاں صاحب؟" اپنی حیرت دور کرنے کے لیے ہم میاں عبدالقدوس کے کان میں پھسپھسائے۔

"کوئی خاص بات نہیں!" انہوں نے ہمارے کان کو جواب سے نوازا۔ "ارسطو نے یا شاید اس کے کسی شاگرد نے بہت پہلے کہا تھا کہ عورت چاہے اچھے حال میں ہو یا برے حال میں یا ایسے کسی مختصر ہال میں' اس کی کوشش ہمیشہ یہ ہی رہتی ہے کہ دوسروں سے کم عمر نظر آئے۔ بزرگی کو عورت کبھی خوشی سے قبول نہیں کرتی!"

زیرِ استقبال ادیبوں میں کئی نقاد بھی تھے۔ ان میں جو سب سے زیادہ نقاد تھا ناظم جلسہ نے سب سے

پہلے اسی کو اپنے خیالات کا اظہار کرنے اور جدید عصری و غیر عصری حسیات پر روشنی ڈالنے کی دعوت دی۔

متعلقہ نقاد نے جو کہ بھیڑ میں بری طرح پھنسا ہوا تھا' پہلے بائیں ہاتھ سے اپنا دایاں ہاتھ تلاش کیا جو ایک نقاد کے زانو کے نیچے دبا پڑا تھا' پھر دائیں ہاتھ سے بدقت تمام اپنی ناک دریافت کی اور بالآخر اس پر ٹکی ہوئی عینک کو دائیں ہاتھ سے بائیں ہاتھ میں پکڑانے میں کامیاب و سرخ رو ہونے کے بعد یوں گویا ہوا۔

"عزیز دوستو! بالزاک نے اپنی مشہور کتاب کے صفحہ تین سو بیس کی آٹھویں سطر میں ایک جگہ لکھا ہے کہ جو لوگ کسی رسمی استقبال یا اعزاز سے بہت خوش ہوتے ہیں مجھے ان کے ادیب ہونے میں شبہ ہے۔ لیکن جو ادیب پرجوش اور گرم جوش استقبال کا شکریہ بھی ادا نہ کرے میرے نزدیک اس کا انسان ہونا مشکوک ہے' ادیب ہونا تو دور رہا---"

جواب میں ناظم جلسہ کی پرجوش تالیاں سنائی دیں۔ دیگر منتظمین جلسہ بھی اس تحسینی حوالہ کا پرجوش تالیوں سے جواب دیتے مگر طبعیاتی اصولوں کے مطابق تالی بجانے کے لیے کم از کم بالشت بھر خلاء ضرور چاہیے جو بدقسمتی سے اس بھیڑ بھرے ہال میں بہت کم لوگوں کو میسر تھی۔

نقاد کہہ رہا تھا---

"اسی طرح کافکا نے بھی اپنی عظیم تصنیف کے چوتھے باب میں اٹھارہویں صفحہ کی آٹھویں سطر میں کہا ہے کہ....."

"کیا واقعی؟ کافکا نے بھی!؟" ایک آواز آئی۔

"جی ہاں اس نے کہا ہے....."

"آٹھویں سطر میں؟" آواز نے پوچھا۔

"جی ہاں آٹھویں سطر میں اس نے....."

"سوچ لیجئے۔ ایک موقعہ اور ہے۔ ہو سکتا ہے ساتویں میں کہا ہو---"

"جی نہیں جناب میرا حافظہ درست ہے۔ یہ بات اس نے آٹھویں سطر میں کہی ہے بلکہ --- بلکہ--- بلکہ میں نے احتیاطاً" ڈائری میں بھی نوٹ کر لیا ہے۔ میں جب بھی کسی کتاب کا مطالعہ کرتا ہوں تو اس کی سطروں کے نمبر ضرور نوٹ کر لیتا ہوں لیکن--- لیکن--- لیکن آپ ہیں کون۔ ذرا سامنے تو آیئے....؟" نقاد نے چاروں طرف گردن گھماتے ہوئے پوچھا۔

"لیکن حضور کافکا تو آٹھویں سطر لکھتا ہی نہیں تھا۔ آٹھ کے ہندسے کو وہ بے حد منحوس مانتا تھا۔ اس لیے ہمیشہ آٹھویں سطر خالی چھوڑ کر نویں سطر پر چلا جاتا تھا۔ اپنے گھر کے زینے میں اس نے آٹھواں پائدان خالی چھوڑ دیا تھا۔ ہمیشہ اسے پھلانگ کر گزر جاتا تھا اور تو اور اس نے اپنی کتاب کا آٹھواں اڈیشن

بھی نہیں چھپنے دیا۔ ساتویں کے بعد ۹واں اڈیشن ہی چھپوایا نتیجتاً اس کے پبلشر کو ایک اڈیشن کا خسارہ جھیلنا پڑا۔ کیا آپ جانتے ہیں آٹھویں ہندسے کو وہ کیوں منحوس جانتا تھا'' گمنام آواز نے پوچھا۔

لیکن نقاد نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ ایک رومال سے چہرے کا پسینہ پونچھ کر رہ گیا اور پھر بے اختیاری میں دائیں ہاتھ سے بایاں کان کھجانے لگا جس پر اس کے قریب کھڑے نقاد نے سخت اعتراض کیا اور اسے بتایا کہ جناب یہ میرا کان ہے۔ کھجانا ہے تو اپنا کھجایئے۔ ہال میں دھیمی دھیمی ''کھی کھی'' کی آواز گردش کرنے لگی۔

''آٹھ کو وہ اس لیے منحوس سمجھتا تھا کہ اس کی پہلی شادی آٹھویں مہینے کی آٹھویں تاریخ کو صبح آٹھ بجے اس خاتون سے ہوگئی تھی جو....''

''جو!؟'' مجمع نے بیک آواز بے تابی سے پوچھا۔

''جو اس کی آٹھویں محبوبہ تھی''۔ آواز نے جملہ پورا کردیا۔

اس پر کئی حاضرین نے ''اوہ!'' کہہ کر ایک لمبی سانس لی جس کے بعد ''کھی کھی'' کی آواز ''خی خی'' کے شور میں بدل گئی۔

''حاضرین۔ حاضرین۔ براہ کرم سنجیدگی اختیار کیجئے۔'' ناظم جلسہ نے التجا کی' ''یہ ادیب حضرات ہمارے مہمان ہیں۔ لہٰذا ان کا احترام ہمارا فرض ہے۔ مہمان نقاد سے میری گزارش ہے کہ وہ اپنا بیان جاری رکھیں۔''

مہمان نقاد نے رومال سے چہرے کا پسینہ دوبارہ پونچھ کر گلا صاف کیا (موخر الذکر کو کھنکھار کر صاف کیا۔ واضح رہے) اور فرمایا---

''ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ کافکا نے بھی بالزاک کے بیان سے اتفاق کیا ہے۔ البتہ بریخت نے اس نظریہ میں کچھ ترمیم کی ہے۔ اس نے کہا ہے....''

''کون سی سطر میں؟'' اسی آواز نے پوچھا۔

نقاد نے گھبرا کر چاروں طرف دیکھا۔ ''آخر آپ ہیں کون؟ سامنے کیوں نہیں آتے؟''

''پہلے سطر بتایئے۔''

''مگر یہ بات کتاب میں نہیں لکھی گئی۔ ایک تقریر میں کہی گئی تھی۔'' نقاد نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

''کوئی بات نہیں۔ تقریر کی بھی تو سطر ہوتی ہے۔ خیر۔ اگر آپ بریخت کی سطر پوشی کرنا چاہتے ہیں تو تقریر کا مقام وقت اور تاریخ ہی بتادیجئے۔''

ہال میں پھر ''کھی کھی'' کا دورہ شروع ہوگیا۔

تبھی ناظم جلسہ نے مداخلت کی۔ ''معاف کیجئے حضرات۔ ایسا لگتا ہے محفل کچھ غیر سنجیدہ ہو چلی

ہے۔ لہٰذا اب میں مہمان نقاد سے گزارش کروں گا کہ وہ جدید حسی عصریات--- اوہ معاف کیجئے جدید عصری حسیات پر کچھ روشنی ڈالیں جو ان کا خاص موضوع ہے۔۔''

یہ سنتے ہی نقاد کی باچھیں کھل گئیں۔ عینک کو دوبارہ ناک پر اچھی طرح جما کر اس نے سینہ پھلایا اور کئی مرتبہ کھانس کر گلا صاف کرنے کے بعد کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ بجلی چلی گئی اور ہال میں اندھیرا ہو گیا۔

''اوفوہ! ارے بھئی جلدی سے روشنی ڈالیے۔'' اسی آواز نے کہا اور پورا ہال قہقہوں کے دھماکوں سے گونج اٹھا۔

کہنے کی ضرورت نہیں کہ یہ آواز اور کسی کی نہیں خود میاں عبدالقدوس کی تھی جو اپنے چاروں طرف کھڑے لوگوں کی وجہ سے سنائی تو سب کو دے رہے تھے مگر نظر کسی کو نہیں آ رہے تھے۔

''اب بس بھی کیجئے خاں صاحب''۔ ہم نے ان کے کان میں کہا۔

''چپ رہو یار۔ مجھے اس وقت ان کی فکر ہے۔'' انہوں نے کہا۔

''کن کی؟''

''روسی محترمہ کی۔ اگر کچھ دیر اور اندھیرا رہا تو ڈر ہے کوئی انہیں اپنی کرسی نہ آفر کر دے۔''

''توبہ توبہ خاں صاحب۔ اندھیرے میں بھی کیسے کیسے خیالات آپ کے دماغ میں آتے ہیں۔''

''روشن خیالات اکثر اندھیرے میں ہی تشریف لاتے ہیں میرے عزیز۔ لہٰذا اب خاموش رہو۔ مجھے روسی ادیبہ کے بارے میں متفکر و متشوش ہونے دو۔''

''ارے بھئی کوئی موم بتی جلایئے۔'' کسی نے زور سے کہا۔ اور تبھی بجلی آ گئی۔

لوگوں نے دیکھا وہ نقاد موقعہ غنیمت جان کر اپنے اردگرد کے حاضرین میں غوطہ لگا گیا تھا اور اب کسی کو نظر نہیں آ رہا تھا۔

میاں عبدالقدوس نے اپنی کرسی پر کھڑے ہو کر روسی ادیبہ کو دیکھا اور اسے سفید سر والے بے ضرر ادیب کی کرسی کے قریب پہلے کی طرح کھڑی پا کر اطمینان سے اپنی کرسی میں بیٹھ گئے۔

ناظم جلسہ نے جلسہ کو جلد ختم کرنے کی نیت سے روسی ادیبہ سے بھی درخواست کر دی کہ وہ اس موقعہ پر کچھ کہیں۔

ادیبہ کچھ شرماتی اور کچھ جھجکتی ہوئی صدر جلسہ کی کرسی کے آگے آئیں اور تاشقندی لہجہ میں کہنے لگیں۔

''آپ لوگوں نے اتنا پیار اور اتنی عزت دی ہے کہ سمجھ میں نہیں آتا کیا کہوں!''

''کہنے کی ضرورت نہیں۔ بس کچھ دیر یوں ہی کھڑی رہیے۔'' میاں عبدالقدوس نے کہا۔

''کمال ہے خاں صاحب۔ آپ ایسی بھیڑ اور گھٹن بھرے ماحول میں بھی رومانٹک ہو سکتے ہیں۔''
ہم نے ان کے حوصلہ کی داد دی۔

''تمہارا کیا خیال ہے؟ رومانٹک ہونے کے لیے کیا اٹلانٹک کی آب و ہوا ہونی چاہیے!؟''

تبھی مہمانوں کا استقبال شروع ہو گیا۔ اعلان کیا گیا کہ غیر ملکی ادیبوں کو بطور اعزاز شال اور ملکی ادیبوں کو بطور تحفہ کتابیں نذر کی جائیں گی۔ ایک صاحب ادیبوں کے نام پڑھنے لگے۔ نام کا اعلان ہوتے ہی متعلقہ ادیب کرسیوں، ٹانگوں اور کندھوں کو دھکیلتا ہوا مہمان خصوصی کے پاس جاتا، اپنا استقبال کراتا، فوٹو کے لیے پوز بناتا اور فوٹو کھنچنے کے بعد خود باہر نکل جاتا یا قریب کھڑے ہوئے لوگوں کی مدد سے باہر نکال دیا جاتا۔ مہمان خصوصی کوئی بزرگ آدمی تھے جو غالباً کرسی میں بیٹھے تھے اس لیے کسی کو نظر نہیں آ رہے تھے۔ صرف ان کا شال یا کتابیں دیتا ہوا بوڑھا ہاتھ کبھی کبھی سروں کے بیچ سے ابھرتا ہوا دکھائی دے جاتا تھا۔

ناظم جلسہ نے ایک دبلے پتلے مخنی سے ادیب کا نام لیا جو دور کسی کونے میں پھنسا ہوا تھا۔

''واہ! اسے کہتے ہیں جنیوئن ادیب''۔ کسی نے پھبتی کسی۔ ''چاہیں تو کھونٹی پر ٹانگ لیجیے۔''

بھلا خاں صاحب کہاں چپ رہنے والے تھے۔ بولے ''ارے صاحب ٹانگنے کی کیا ضرورت ہے۔ تھوڑی کوشش کریں تو دیوار پر چپکا بھی سکتے ہیں۔ لوگ سمجھیں گے پکاسو کا شاہکار ہے۔''

ناظم جلسہ نے ایک بار پھر حاضرین سے سنجیدگی اختیار کرنے کی درخواست کی اور مخنی ادیب اور مہمان خصوصی کے درمیان دشوار گذار فاصلے کو مد نظر رکھتے ہوئے مشورہ دیا کہ مہمان ادیب کو بلا کر استقبال کرنے کی بجائے وہیں کھڑے کھڑے اس کا استقبال کرا دیا جائے اور ان کا تحفہ وہیں پہنچا دیا جائے۔

مگر اس مشورہ سے مطمئن ہونے کی بجائے مخنی ادیب اس فوٹو گرافر کی طرف بے چارگی سے دیکھنے لگا جو ہر ادیب کے استقبال کی تصویر کھینچ رہا تھا۔

ناظم جلسہ بڑے گھاگ تھے۔ انہیں فوراً اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ چنانچہ مشورہ جیسے دیا تھا ویسے ہی واپس لے لیا۔

مخنی ادیب نے قدم آگے بڑھانے اور حصار جم غفیر کو توڑنے کی کوشش کی مگر ہر مرتبہ ناکام رہا۔ بالآخر کچھ لوگوں کو اس کی حالت پر ترس آ گیا۔ انہوں نے ادیب کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور لوگوں کے سروں کے اوپر سے مہمان خصوصی تک پہنچا دیا اور پھر وہاں سے اسی طرح ہال کے باہر پہنچا کر ڈمپ کر دیا جہاں استقبال شدہ ادیب پہلے ہی گھاس کے میدان میں پڑے اپنے جوڑ سہلا رہے تھے۔

☆ ☆ ☆

حساب

میاں عبدالقدوس کا کہنا ہے کہ جو قومیں حساب کتاب نہیں جانتیں اور اپنا حساب ٹھیک نہیں رکھ سکتیں وہ بہت جلد تاریخ کے کوڑے دان کا حصہ بن جایا کرتی ہیں جو بعد میں انہیں جغرافیہ کے کوڑے دان میں ڈال دیتا ہے.....!

"یہاں آکر وہ دیوار پر ٹنگے اٹلس میں پاکستان اور بنگلہ دیش کے نقشوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں اور پھر ہندوستان کے نقشہ کی طرف انگلی گھما کر اس جملہ پر اپنا قول مکمل کرتے ہیں کہ... اور ان کے گھر کے دروازوں پر ہمیشہ ٹاٹ کے پردے لٹکے رہتے ہیں۔

چنانچہ' ایک روز ہم نے ان سے التجا کی کہ جناب والا ہمیں بھی کچھ حساب کتاب سکھا دیجئے کیونکہ ہمارے گھر کے دروازے پر تو ٹاٹ کا کیا کیسا بھی پردہ نہیں ہے۔ خدا را ہماری بھی کچھ ترقی کرا دیجئے' فدوی آپ کو دعائیں دے گا وغیرہ وغیرہ۔

عرض سن کر خاں صاحب پہلے تو خشمگیں نگاہوں سے ہمیں گھورتے رہے' پھر بولے۔ "میرا مذاق اڑا رہے ہو؟"

مگر جب ہم نے کہا کہ توبہ کیجئے حضور' یہ تاب مجال یہ طاقت کہاں مجھے' ہم سچ مچ ترقی کرنا چاہتے ہیں' تو رفتہ رفتہ وہ آدمی کی جون میں واپس آگئے۔ بلکہ کچھ دیر بعد تو باقاعدہ مسکرانے بھی لگے۔ فرمایا۔ "پہلے یہ بتاؤ کہ گنتی کہاں تک آتی ہے اور پہاڑے کتنے یاد ہیں؟"

ہم نے کہا۔ "پہلے تو ایک سے لے کر بیس تک پوری گنتی آتی تھی مگر اب جب سے کیلکولیٹر خریدا ہے گیارہ بارہ کے بعد حافظہ جواب دے جاتا ہے۔"

"اور پہاڑے؟"

"وہ بھی چند یاد ہیں۔"

"مثلاً؟"

"مثلاً۔ کوہ ہمالیہ، کوہ آلپس، ہندوکش اور مسلم کش وغیرہ....."

"لاحول ولاقوت!" انہوں نے غصہ میں حقہ کی نے کو اس زور سے جھٹکا دیا کہ چلم نیچے گرتے گرتے بچی۔ "میں پہاڑوں کی نہیں پہاڑوں کی بات کر رہا تھا۔"

"میں بھی تو پہاڑ ہی عرض کر رہا ہوں جناب والا۔" ہم نے کہا۔

"اوفوہ! ارے بھئی پہاڑوں سے میرا مطلب پہاڑ کی جمع نہیں ہے۔ پہاڑوں سے میری مراد ہے پہاڑے کی جمع۔ یعنی دو اکم دو، دو دونی چار۔"

"اوہ! تھوڑا تھوڑا دے دے میرے دل کو قرار۔ اس پرانے فلمی دوگانے کی بات کر رہے ہیں؟" ہم نے انہیں چھیڑنے کے لئے کہا۔

"استغفراللہ بلکہ انا للہ! میں بات کر رہا ہوں حساب والے پہاڑوں کی اور جناب کو فلمی گانا یاد آ رہا ہے۔" انہوں نے ڈانٹا۔

"اوہ، معاف کیجئے جناب، یعنی آپ ان پہاڑوں کی بات کر رہے ہیں جو ہم بچپن میں شیخ یا مین اینڈ سنز سے دو پیسے کا ایک لاتے تھے، اور جنہیں اسکول کے ہیڈ ماسٹر صاحب کے سامنے پوری جماعت با جماعت ہل ہل کر یاد کیا کرتی تھی....."

"جی ہاں میں ان ہی پہاڑوں کا ذکر کر رہا ہوں۔"

"پہلے تو جناب تقریباً سارے پہاڑے آتے تھے، مگر اب صرف ایک یاد رہ گیا ہے۔"

"کون سا؟"

"ایک کا۔ کہئے تو سناؤں۔ ایک اکم ایک، ایک دونی دو، ایک تیا تین....."

"بس بس ٹھیک ہے۔ میرا خیال ہے ارتھمیٹک تمہاری سمجھ میں نہیں آئے۔ اچھا ہوگا کہ تم الجبرے سے شروعات کرو۔ وہ آسان بھی ہے اور دلچسپ بھی۔"

"الجبرا!؟ وہ جو عرب کے زبردست عالم شیخ جابر القمر کی ایجاد ہے اور جبراً پڑھایا جاتا ہے اور جسے طلبا بہ رضا و رغبت نہیں طوعاً و کرہاً پڑھتے ہیں!"

خاں صاحب کی تیوریاں چڑھ گئیں۔ غصہ سے بولے۔ "تمہیں حساب سیکھنا ہے یا نہیں؟"

"سیکھنا ہے حضور سیکھنا ہے۔" ہم نے جلدی سے کہا۔ "ٹھیک ہے الجبرے سے ہی شروع کیجئے۔"

بے ترتیب

پیش لفظ	7
میں اور ہم	12
جان ہے تو جہان ہے پیارے	16
ادب اور ڈاکٹری	23
ایک یادگار استقبالیہ	32
حساب	39
سفر وسیلہ صفر	47
فرہنگ جدید، انگریزی۔ اردو	58
لنگڑی ترازو	68
بڑے بھائی جان	73
مسئلہ تذکیر و تانیث	78
ڈاکٹر	83
وکیل	91
انصاف ترا دیکھا	95
شاعر صحافی اور مجاور	99
زبان یار من.....؟	106

"تو پھر غور سے سنو! الجبرا کی بنیاد ہے اصول مساوات۔ اگر الف بے کے برابر ہو اور بے جیم کے برابر، تو جیم الف کے برابر ہو گا۔"

"بھئی واہ! یہ تو بہت آسان ہے خاں صاحب۔ الف بے تے کی ہمیں پوری تختی یاد ہے۔ کہئے تو سنائیں۔" ہم نے جوش میں آکر کہا۔

"ٹوکو مت بیچ میں۔" خاں صاحب نے ڈانٹ دیا۔ "الجبرے میں مختلف النوع چیزوں کو ایک جگہ جمع کر کے تداخل تناظری اور تنافر تفاخری[1] کے اصولوں کی مدد سے ان اشیاء کی نامعلوم قیمت یا شرح معلوم کی جاتی ہے اور اس میں اصول مساوات سے مدد لی جاتی ہے۔ مثال کے طور پر اگر ایک آدمی گھر سے سو روپے لے کر بازار جائے اور وہاں سے ایک کلو گھی دو کلو تیل اور تین کلو نمک لے کر آنے کے بعد اس کی جیب میں صرف چار روپے باقی بچیں تو الجبرا گھی، تیل اور نمک کی قیمت بتا دے گا! کیا سمجھے؟"

"معاف کیجئے خاں صاحب۔ اول تو آپ کی مثال غلط ہے اتنا سامان خرید کر لانے پر ۱۰۰ روپے میں سے کچھ بچتا تو دور رہا، الٹا قرض چڑھ جائے گا۔ دوسرے، ان چیزوں کی قیمت معلوم کرنے کے لئے الجبرے کو تکلیف دینے کی کیا ضرورت ہے؟ یہ سب تو پنساری خود ہی بتا دے گا!"

"اے احمق الذین یہ سب فرض کرنے کی باتیں ہیں۔" خاں صاحب ہوئے بولے۔ "حساب میں سب کچھ فرض کرنا پڑتا ہے۔ تب جا کر لا کا پتہ چلتا ہے۔"

"لا یعنی قانون؟"

"جی نہیں۔ لا، یعنی نہیں۔ الجبرے میں سب سے پراسرار شئے یہی ہے۔ اسی پر سارے الجبرے کی بنیاد ہے۔ لا وہ شے ہے جو ہمیشہ نگاہوں سے اوجھل رہتی ہے۔ یہ صرف الجبرا ہے جو اس کے چہرے سے پردہ اٹھاتا ہے۔ الجبرا نہ ہوتا تو لا ہمیشہ روپوش رہتا۔ کوئی اس کا پتہ نہ لگا سکتا۔"

"یعنی لا اسے کہتے ہیں جو معلوم نہ ہو۔" ہم نے کہا۔

"درست!"

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ الجبرا ہمیں بتا سکتا ہے کہ جب کوئی سیاسی لیڈر جلسہ میں تقریر کرتا ہے تو اس کے دل میں کیا ہوتا ہے۔ اسمگلر کس راستے سے ہیروئن اور آر ڈی ایکس اسمگل کرتے ہیں۔ بلیاں کس طرف سے آکر گھروں میں دودھ پی جاتی ہیں۔ پاکستان نے کتنے ایٹم بم بنا لئے ہیں، اور مسئلہ کشمیر کا حل کیا ہے۔ یہ سب باتیں الجبرے سے معلوم کی جا سکتی ہیں!؟"

"یقیناً!" انہوں نے اکبر اعظم پر تھوی راج کپور جیسی بلند اور گونج دار آواز میں کہا۔ "اگر الجبرا کے اصولوں کو زندگی اور سماج میں نافذ کیا جائے اور سماج دشمن، ملک دشمن، قوم دشمن عناصر کے سروں

[1] : ان اصطلاحات کے معنی کسی کو معلوم ہوں تو ناچیز کو ضرور بتائیں بڑی عنایت ہوگی

پر جبر و قہر کا ڈنڈا لہراتا رہے تو یہ بھی ممکن ہے۔ البتہ بلیوں کا مسئلہ دوسرا ہے۔ ان کے خفیہ راستے چوہے ہی بہتر طور پر بتا سکتے ہیں۔ بہرحال بات ہو رہی تھی پنساری کی۔"

"جی ہاں۔" ہم نے سعادت مندانہ انداز میں کہا۔

"مان لو خریدار پنساری سے گھی تیل اور نمک کی الگ الگ قیمت پوچھنا بھول گیا ہے' یا شہر میں ریز روشن کی حمائت و مخالفت میں شہر بند ہے' یا پنساری یوں ہی زی ٹی وی پر کوئی گرما گرم پروگرام دیکھنے کے لئے دکان بند کر کے چلا گیا ہے' تب ان چیزوں کی قیمت کون بتائے گا؟"

"الجبرا!" ہم نے مزید سعادت مندی کے لئے سر جھکا دیا۔

"بے شک! اصول مساوات سے سب کچھ معلوم ہو جاتا ہے۔"

"مگر یہ اصول مساوات تو سمجھائیے خاں صاحب۔ یہ کیا ہوتا ہے؟"

"اصول مساوات کو سمجھنا بہت آسان ہے۔ اس کو یوں سمجھو کہ دال اور چاول ملا کر پکائے جائیں تو کھچڑی تیار ہو جائے گی۔ الجبرے میں اسے اس طرح لکھیں گے۔۔

دال + چاول = کھچڑی

چنانچہ کھچڑی۔ دال = چاول

اور کھچڑی۔ چاول = دال

یعنی کھچڑی سے دال نکال دی جائے تو چاول بچیں گے۔ اور چاول نکال دیئے جائیں تو دال بچے گی۔

"اور اگر دال سے کھچڑی نکال دی جائے تو؟" ہم نے پوچھا۔

"دال سے کھچڑی؟" خاں صاحب الجھ گئے۔ پھر کچھ دیر سوچنے کے بعد بولے۔ "نہیں' دال سے کھچڑی نہیں نکل سکتی۔"

"نکل کیوں نہیں سکتی!" ہم نے کہا۔ "دیکھئے میں بتاتا ہوں۔

چونکہ دال + چاول = کھچڑی

اس لئے دال۔ کھچڑی = ۔ چاول"

"۔ چاول؟ یعنی نفی چاول؟ اس کا کیا مطلب ہوا؟" خاں صاحب نے پوچھا۔

"اس کا مطلب یہ ہے کہ چاول نفی ہوں گے۔ یعنی ہمارے پاس نہیں پنساری کی دکان پر ہوں گے۔ اور اس کا مطلب یہ ہو گا کہ ہم نے صرف دال خریدی ہے۔ اور صرف دال سے کھچڑی بنانے کی کوشش کر رہے ہیں جو کہ ناممکن ہے۔ پس ثابت ہوا کہ جو کھچڑی ہم بنا رہے تھے وہ اصلی نہیں خیالی کھچڑی ہے!"

پہلے تو خاں صاحب ہمیں پھٹی پھٹی حیران آنکھوں سے دیکھتے رہ گئے۔ پھر، جیسے انہیں احساس ہوگیا کہ ہم نے گول داغ دیا ہے۔ چنانچہ فوراً ہی جوابی حملہ کرتے ہوئے بولے۔

"ظاہر ہے کھچڑی پور میں رہنے والا آدمی خیالی پلاؤ تو بنانے سے رہا۔ خیالوں میں بھی بنائے گا تو کھچڑی ہی بنائے گا۔ بہرحال آج میری سمجھ میں آگیا ہے کہ تمہارے اب تک ترقی نہ کرنے کی پہلی وجہ یہ ہے کہ تم علم ریاضی سے نابلد ہو۔ اور دوسری، تیسری و چوتھی وجہ یہ ہے کہ تم حساب الجبرا اور اقلیدس سے بھی ناواقف ہو۔"

"ٹھیک ہے خاں صاحب!" ہم نے سرد آہ بھر کر کہا۔ "حساب اور الجبرا تو سمجھ میں آگیا کہ ہمارے سمجھنے کی چیز نہیں۔ مگر یہ اقلیدس کون بزرگوار ہیں۔ ان سے تو کبھی ملاقات نہیں ہوئی۔"

"بزرگوار نہیں برخوردار، میں علم اقلیدس کی بات کررہا ہوں جو مشہور مصری عالم، حکیم اقلیدس کی ایجاد ہے اور جسے تم جیسے ہماشما[1] جیومیٹری کے نام سے جانتے ہیں۔"

"الٰہی خیر!" ہم گھبراگئے۔ "کہیں آپ فیثاغورس والی جیومیٹری کی بات تو نہیں کررہے ہیں۔ خدا کے لئے اس کا تو نام بھی نہ لیجئے۔ ورنہ وہ بھیانک خواب پھر شروع ہوجائیں گے جو زمانہ طالب علمی میں ہمیں صوفی طاہر حسن کی کلاس اٹینڈ کرنے کے بعد رات میں آیا کرتے تھے۔"

"کیسے خواب؟ کون صوفی طاہر حسن؟" انہوں نے پوچھا۔

"صوفی طاہر حسن ہمیں اسلامیہ انٹر کالج میں الجبرا اور جیومیٹری پڑھایا کرتے تھے۔ اور جس روز ان کا جیومیٹری کا پیریڈ ہوتا تھا اس رات ہم یہ خواب ضرور دیکھتے تھے کہ لمبی سفید داڑھی والی ایک خوفناک خاتون ہمارے پیچھے دوڑ رہی ہے اور کہتی جاتی ہے، ٹھہر مردود۔ ابھی مزہ چکھاتی ہوں۔ میرا نام فیثاغورس ہے۔"

خاں صاحب نے عینک نیچے سرکا کر ہمیں بغور گھورا۔ پھر افسوس سے سر ہلا کر بولے۔

"داڑھی والی عورت! بہت خوب! ایک دن ضرور خاندان کا نام روشن کروگے۔ پاتھاگورس آج زندہ ہوتا اور تمہارا خواب سن لیتا تو یونان چھوڑ کر بھاگ کھڑا ہوتا اور ہیگ کی عالمی عدالت میں تم پر ہتک عزت کا مقدمہ دائر کردیتا۔"

ان کے تبصرے نے ہمیں کسی قدر شرمندہ کردیا۔ لہٰذا بات ٹالنے کے لئے ہم نے کہا۔

"چلئے جانے دیجئے۔ آپ فیثاغورس کو چھوڑ کر باقی جیومیٹری سمجھا دیجئے۔ شائد اسی سے کچھ ترقی کرجائیں۔"

[1]: خاں صاحب ہماشما ان لوگوں کو کہتے ہیں جو ہما اور شمع جیسے رسالے پڑھ کر بالغ ہوئے ہوں۔

"آہ۔" انہوں نے حقہ کا کش لینے کے بعد افسوس بھرے انداز میں دھواں خارج کرتے ہوئے کہا۔ "کاش ایسا ہو سکتا۔ کاش تم جانتے کہ جیومیٹری سے فیثا غورس کو نکالنا کس قدر مشکل کام ہے۔ طالب علموں کی کتنی ہی نسلیں اس کوشش میں ناکام اور فیل ہو گئیں۔ مگر فیثا غورس آج بھی جوں کا توں کھڑا ہے۔ دنیا کے تمام اساتذہ اس کی پشت پناہی پر ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اگر فیثا غورس کو جیومیٹری سے نکال دیا گیا تو ہماری عزت کون کرے گا؟ چنانچہ اے طالب علمو! ہم جیومیٹری کو تمہارے کورس سے نکال سکتے ہیں، فیثا غورس کو نہیں۔"

"مگر اس معاملے کا اساتذہ کی عزت سے کیا تعلق ہے۔ فیثا غورس تو ہزاروں سال پہلے داعی اجل کو لبیک کہہ چکا ہے۔"

"تو اس سے کیا ہوتا ہے۔ فیثا غورس بھلے ہی اس دنیا سے چلا گیا مگر تین مربعوں والی اپنی تھیورم پیچھے چھوڑ گیا جو آج تک زندہ ہے۔ بڑا ہی عیار حکیم تھا خدا بخشے!"

"پھر بھی۔ اساتذہ کی عزت سے اس کا کیا تعلق؟"

"افسوس! کیا تم یہ بھی نہیں جانتے کہ آج کل کے طلباء کس قدر گستاخ، بدتمیز، بدکلام اور بدخو واقع ہوئے ہیں۔ اساتذہ سے ذرا بھی خوف نہیں کھاتے۔ اب ایسے میں اگر فیثا غورس کو بھی جیومیٹری سے نکال دیا گیا تو بے چارے اساتذہ کے پاس کیا ہتھیار باقی رہ جائے گا۔ کس چیز سے ڈرائیں گے طلباء کو؟"

"اچھا چلئے چھوڑیئے۔ آپ جیومیٹری سمجھائیے!" ہم نے کہا۔

میاں عبدالقدوس نے حقے کے تین چار لمبے کش لئے۔ اور چند لمحے خاموش رہنے کے بعد بولے۔

"جیومیٹری میں سب سے پہلے خط یعنی لکیر اور نقطہ یعنی نقطہ کو ٹھیک طرح سمجھنا بہت ضروری ہے۔ پہلے ہم خط کو لیتے ہیں اسے دھیان سے سنو!"

"ٹھیک ہے!" ہم کانوں پر ہاتھ رکھ کر ہمہ تن گوش ہو گئے۔

"تمام یونانی و ایرانی فلسفی اس پر متفق ہیں کہ....."

"یونانی و ایرانی؟" ہم نے ٹوکا۔ "ایران کا یونان سے کیا تعلق۔ ایران میں یا تو شاعر گذرے ہیں یا آج کل آیت اللہ گذر رہے ہیں۔ فلسفیوں میں ایک نام شیخ سعدی کا سننے میں آتا ہے مگر وہ بھی شاعری کرتے تھے۔ اور بالفرض کوئی فلسفی ایران میں کسی طرح گذر بھی گیا ہے، تو اس کا علم حساب سے کوئی تعلق نہیں تھا۔"

"کوئی بات نہیں۔ ایران اور یونان ہم قافیہ تو ہیں۔ دراصل ایران سے میرا مطلب تھا مصر۔"

"کیا بات کرتے ہیں خاں صاحب آپ۔ کہاں ایران کہاں مصر!"

"شائد تم نہیں جانتے میرے عزیز کہ سکندر اعظم کے زمانے میں یونان مصر تک اور مصر ایران تک پھیل گیا تھا۔ اس کے آگے چونکہ ہندستان تھا اس لئے یونان کا قافیہ اور سکندر کا قافلہ افغانستان تک رہ گیا۔"

"ٹھیک ہے۔" ہم نے سرد آہ کے ساتھ ہتھیار ڈال دیئے۔ "تاریخ کی بحث میں آپ کے آگے کون ٹک سکتا ہے۔ چلئے آپ خط یعنی لکیر کی طرف آیئے۔"

"ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ تمام فلسفی اس بات پر متفق ہیں کہ خط اس لکیر کو کہتے ہیں جو ایک نقطہ سے دوسرے نقطہ تک اس طرح کھینچی جائے کہ اس پر خط کا شبہ ہونے لگے۔"

"ذرا آسان لفظوں میں سمجھایئے۔" ہم نے احتجاج کیا۔

"اچھا، تو یوں سمجھو کہ جس میں لمبائی تو خوب ہو مگر موٹائی چوڑائی اور گہرائی بالکل نہ ہو اسے کیا کہیں گے؟"

"آج کا مسلمان!"

"لاحول ولا قوت۔ میں مسلمان کی نہیں لکیر کی بات کر رہا ہوں۔" میاں عبدالقدوس جھنجھلا گئے۔

"کوئی بات نہیں! آج کا مسلمان لکیر کا فقیر ہی تو ہے۔"

"افوہ! میں فقیر والی لکیر کی نہیں اس لکیر کی بات کر رہا ہوں جو جیومیٹری میں کاغذ پر کھینچی جاتی ہے۔ ایک نقطہ سے دوسرے نقطہ تک! کیا سمجھے؟"

"ٹھیک ہے سمجھ لیا۔ اب آگے بڑھیے۔" ہم نے کہا۔

"خط کئی طرح کے ہوتے ہیں۔ مثلاً خط جدی، خط سرطان، خط استوا، لیکن ان خطوں کا تعلق جغرافیہ سے ہے۔ جیومیٹری میں دو ہی طرح کے خط ہوتے ہیں ایک سیدھا ایک ٹیڑھا۔"

"کیا مطلب؟" ہم نے پوچھا۔

"مطلب یہ کہ ایک تو سیدھی لکیر ہوتی ہے، دوسری ٹیڑھی۔ سیدھی لکیر وہ ہوتی ہے جو بالکل سیدھی ہو اور ٹیڑھی لکیر وہ جو قطعی ٹیڑھی ہو۔ یہ تو ہوئی لکیر اب یہ سمجھو کہ نقطہ کسے کہتے ہیں۔"

"بتایئے کسے کہتے ہیں؟"

"اسے، جس میں نہ لمبائی ہو نہ گہرائی، نہ موٹائی، نہ چوڑائی!"

"یہ تو آپ نے ہندستانی مسلمان کی تعریف کردی۔ آخر آپ مسلمانوں کے پیچھے کیوں پڑ گئے ہیں۔"

میاں عبدالقدوس نے حقے کی نے ایک طرف رکھ دی۔

"معلوم ہوتا ہے تم آج ٹنڈے کھا کر آئے ہو اور اب ڈنڈے کھانے کی خواہش ہے۔ خیال تھا کہ لکیر اور نقطہ کے بعد آج کی نشست میں تمہیں دائرہ، مثلث مستطیل، مربع، خط عمودی اور زاویہ قائمہ وغیرہ کے بارے میں بتاؤں گا۔ مگر تم آج کچھ غیر سنجیدگی کے موڈ میں ہو۔ اب میں دائرہ کا ذکر کروں گا تو تم اسلامی دائرے کی بات لے بیٹھو گے جس سے کسی بھی مسلمان کو نکال دینا دنیا کا سب سے آسان کام ہے۔ اس لئے آج کی کلاس منسوخ۔ جیومیٹری تم جیسوں کے لئے نہیں بنی ہے۔ خدا حافظ!"

یہ کہہ کر انہوں نے تاریخ اسلام کی تیسری جلد اٹھائی اور مطالعہ میں مشغول ہوگئے۔ ہمارے لئے بھی اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ صادق حسین سردھنوی کا کوئی موٹا سا تاریخی ناول اٹھاتے اور کچھ دیر مسلمانوں کے ماضی اور غازیوں کے رومان پر سر دھنتے رہتے۔

☆ ☆ ☆

سفر وسیلۂ ظفر

یوں تو ہندستان جنت نشاں میں سفر کرنے کا اردو اور انگریزی میں ایک ہی مطلب ہے۔ سفر کرنا یعنی سفر(SUFFER) کرنا۔ لیکن تمام تر کلفتوں اور الجھنوں کے باوجود سفر کرنا جتنا دلچسپ اور سودمند مشغلہ ہمارے ملک میں ہے اتنا شاید ہی دنیا کے کسی اور ملک میں ہوگا۔

دوسرے ملکوں میں جیسے ہی سفر کرنے کے لیے آپ ٹرین، بس یا ہوائی جہاز میں سوار ہوں گے تمام کھڑکیاں دروازے اپنے آپ بند ہوجائیں گے اور آپ کا رابطہ ساری دنیا سے کٹ جائے گا۔ اس کے بعد اپنا دل آپ کو اخبار، میگزین یا ائرہوسٹس کے مطالعہ سے بہلانا ہوگا یا پھر کانوں میں روئی اور آنکھوں پر سیاہ کپڑے کا چشمہ لگا کر سونے کی کوشش کرنا ہوگی تاکہ کسی طرح وقت کٹ جائے۔

لیکن ہوسکتا ہے تب بھی وقت نہ کٹے اور آپ کو آرتھر ہیلی یا الیگزینڈر دوما کے کسی ناول کا سہارا لینا پڑجائے۔ کچھ ہم جیسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو بے چارے کسی بھی طرح وقت نہیں کاٹ پاتے۔ وقت گزارنے کی کوششوں میں اچھا خاصا وقت برباد کردیتے ہیں اور پھر عین اس وقت جب وقت کاٹنے کی کوئی کوشش کامیاب ہوتی نظر آتی ہے اچانک اسٹیشن آجاتا ہے اور ساری کوششیں دھری رہ جاتی ہیں۔

اپنے ملک میں حالات کافی مختلف ہیں۔ ہمارے یہاں سفر تمام کرنے میں اتنا وقت نہیں لگتا جتنا اسے شروع کرنے میں لگ جاتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر آپ کو بس سے کہیں جانا ہے تو کئی بسوں کے گزرنے کے بعد کہیں جاکر آپ کو ایک ایسی بس ملے گی جس میں گیٹ کے ڈنڈے سے بہ آسانی لٹکا جاسکے اور آپ کسی قدر آرام سے اپنے گھر یا دفتر پہنچ سکیں۔

اسی طرح سپرفاسٹ ٹرین سے سفر کرنا ہے تو پہلے کئی روز تک ریزرویشن کی کھڑکی کے چکر لگانے

ہوں گے تب جا کر معلوم ہو گا کہ مام چند قلی بے چارا بڑا اچھا آدمی ہے اور وہ کوچ کے کنڈکٹر سے آپ کا معاملہ بخوبی طے کرا سکتا ہے۔

اور اگر خدانخواستہ آپ کو ہوائی جہاز سے کہیں جانا ہے تو بس اللہ مالک ہے! آپ کو اصلی ٹریول ایجنٹ بھی مل جائے گا جو آپ کو اصلی ٹکٹ بھی دلا دے گا۔ پھر جہاز کے ٹیک آف سے ٹھیک چار گھنٹے پہلے آپ کو تلاشی وغیرہ لے کر ائرپورٹ میں داخلے کی اجازت بھی مل جائے گی۔ یہاں تک کہ آپ بروقت ہوائی جہاز میں بھی بیٹھ جائیں گے۔

مگر عین ٹیک آف کے وقت معلوم ہو گا کہ جہاز کے ایک پہیے کے لیور کے ہینڈل میں جو ہک لگا ہوا ہے اس کے آٹھ پیچوں میں سے ایک پیچ پوری طرح کسا ہوا نہیں ہے۔ لہٰذا جہاز ایک گھنٹے بعد اڑان بھرے گا۔

پھر جب ایک گھنٹہ پورا ہونے والا ہو گا تو جہاز کے ایڈریس سسٹم پر آپ کو بتایا جائے گا کہ اس وقت کٹھمنڈو میں برف گر رہی ہے' نینی تال میں رطوبت نسبتی ننانوے اعشاریہ نو آٹھ فیصد ہے اور روہتک میں درجہ حرارت معمول سے آٹھ ڈگری اوپر چلا گیا ہے لہٰذا جہاز سری نگر میں لینڈ نہیں کر سکتا' لہٰذا دہلی سے ایک ڈیڑھ گھنٹے بعد ٹیک آف ہو گا' لہٰذا تمام مسافر اپنی اپنی سیفٹی بیلٹ کھول لیں۔

ڈیڑھ گھنٹہ گزرنے کے بعد ہو سکتا ہے فون پر کوئی شخص یہ اطلاع دے دے کہ جہاز میں بم رکھا ہوا ہے۔ بس اب آپ گئے کام سے' فوراً جہاز خالی کرا لیا جائے گا۔ پھر پولس کے افسر آئیں گے۔ پھر پولس کے کتے آئیں گے۔ پھر آپ کی فروٹ باسکٹ میں رکھے ہوئے تمام سنترے اور سیب بم کے شبہ میں چھیل چھیل کر دیکھے جائیں گے اور دو گھنٹے بعد آپ کو مژدۂ جانفزا ملے گا' اب جہاز پندرہ منٹ میں اڑنے کے لیے تیار ہے۔

تب تک اگر جہاز کے عملے کی شفٹ تبدیل نہیں ہوئی ہو گی تو جہاز ٹھیک وقت پر روانہ ہو جائے گا اور یوں آپ دہلی سے سری نگر تک کا چالیس منٹ کا ہوائی سفر مجموعی طور پر آٹھ گھنٹے انسٹھ منٹ میں طے کر لیں گے۔

باقی رہے اصل ہوائی سفر کے چالیس منٹ تو ان کا کیا ہے' وہ سیفٹی بیلٹ باندھنے اور کھولنے میں گذر جائیں گے اور آپ کو وقت گزارنے کے مرحلے سے نہیں گذرنا ہو گا۔

یہ بھی کہتے ہیں کہ سفر وسیلہ ظفر ہوتا ہے۔ لیکن کم از کم دہلی میں چلنے والی بسوں کی حد تک یہ مقولہ درست نظر نہیں آتا۔ ان بسوں میں سفر کرنے کے بعد سفر وسیلہ صفر معلوم ہوتا ہے۔ اس ترمیم شدہ مقولہ کا مطلب آپ آگے چل کر سمجھیں گے۔ یہاں ہم صرف اتنا کہیں گے کہ ہندستانی بسوں بالخصوص دہلی کی بسوں نے بنی نوع انسان کو وہ وہ دکھ دیئے ہیں کہ رہے نام اللہ کا! اور ستم یہ کہ انسانی حقوق کی

آواز اٹھانے والوں نے آج تک اس طرف توجہ نہیں دی ہے۔

ہم بھی قسمت سے ان عام شہریوں میں شامل ہیں جنہیں دفتر سے گھر اور گھر سے دفتر جانے کے لیے بسوں کے ذریعہ ہر روز اردو اور انگریزی دونوں میں سفر کرنا پڑتا ہے۔ اور وہ بھی دہلی کی بسوں میں جو اتنی تیز رفتار ہوتی ہیں کہ مقررہ اسٹاپ پر بھی نہیں رکتیں۔ باقی ہر جگہ رک جاتی ہیں۔

اس طرح جو سفر ایک گھنٹے میں پیدل طے ہو سکتا ہے اسے یہ بسیں سوا گھنٹے میں پورا کر لیتی ہیں۔ اس پر بھی جب ہم بس سے اترتے ہیں اور نتیجے کے طور پر دفتر میں دو گھنٹے لیٹ پہنچتے ہیں تو شکر ادا کرتے ہیں کہ آج بس نے ٹھیک وقت پر عین لنچ کے بعد دفتر پہنچا دیا!

اتفاق سے جس روٹ کی بسوں سے جانا پڑتا ہے اس پر بسوں میں اندر اور باہر مسافروں کی اس قدر بھیڑ ہوتی ہے کہ کبھی کبھی تو بس بھی دکھائی نہیں دیتی۔ بلکہ بیچ پوچھے تو کئی مرتبہ ہمیں محض اندازے سے سمجھنا پڑتا ہے کہ جس جگہ لوگوں کا جم غفیر دکھائی دے رہا ہے' آدمی پر آدمی چڑھا بیٹھا ہے' کوئی کسی کی ٹانگ کھینچ رہا ہے' کوئی کسی کو دھکا دے رہا ہے اور ایسا لگتا ہے کہ پی اے سی اب آیا ہی چاہتی ہے' تو اگر بیچ میں وی ایچ پی یا بابری مسجد ایکشن کمیٹی نہ ہوئی تو ایک نہ ایک بس ضرور ہوگی۔

ایسی حالت میں ہمارے لیے یہ پہچاننا بڑا مشکل ہوتا ہے کہ بس میں داخل ہونے کا دروازہ کس طرف ہے؟ اور یہ کہ وہ آ رہی ہے یا جا رہی ہے؟

آخر جب بھیڑ سمیت بس آگے کھسکتی ہے تب جا کر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ارے! اس کا پچھلا دروازہ تو آگے ہے!

اس کے بعد ہم بس پکڑنے کے لیے دوڑ پڑتے ہیں اور تب تک دوڑتے رہتے ہیں جب تک اگلے اسٹاپ پر نہیں پہنچ جاتے۔ یقین کیجئے' کئی مرتبہ ہم سڑک پر اسی طرح بذریعہ بس پیدل دوڑتے دوڑتے دفتر اور گھر پہنچ کر' جلد آنے کے لیے افسروں کی شاباش اور گھر والوں کی دعائیں لے چکے ہیں۔

تاہم اس سے یہ ہرگز نہ سمجھ لیجئے کہ ہمیں بس کے اندر سفر کرنے کا موقع نہیں ملتا۔ ملتا ہے صاحب' اکثر ملتا ہے۔ اور تب تو ضرور ملتا ہے جب ہم بس میں داخل ہونے کی خاص الخاص ترکیب استعمال کر لیتے ہیں۔ اگر آپ بھی یہ ترکیب جاننا چاہتے ہیں تو لیجئے سنئے۔ اچھی طرح یاد کر کے خود بھی اس پر عمل کیجئے اور ہمارے حوالے سے دوسروں کو بھی بتائیے تاکہ وہ بھی فائدہ اٹھا سکیں اور ہمارے حق میں دعائے خیر کرتے رہیں۔

ترکیب یہ ہے کہ جیسے ہی بس آئے اور لوگ اس میں داخل ہونے کے لئے دروازے پر ٹوٹ پڑیں' آپ آرام سے سب کے پیچھے کھڑے ہو جائیں اور دروازے کے ڈنڈے تک ہاتھ پہنچانے کے لیے زور آزمائی کرنے کی بجائے تھوڑی سی طاقت استعمال کر کے یا کسی کی ٹانگوں کے بیچ سے نکل کر کسی طرح

بھیڑ کے بیچ میں اٹک جائیں۔ بس اس کے بعد آپ کو کچھ کرنے کی ضرورت نہیں۔ چپ چاپ بدن کو ڈھیلا چھوڑ کر آنکھیں بند کر لیجے۔ چند لمحوں میں ہی آپ کا وجود کشش ثقل سے آزاد ہو جائے گا اور آپ اپنے پورے وجود کے ساتھ اوپر اٹھنے لگیں گے۔ اس طرح کسی کے کندھے، کسی کے بازو اور کسی کے سر پر سواری کرتے کرتے آپ بھیڑ کی کیو مولیٹو فورس (اجتماعی قوت) کے سائنسی اصول کے تحت بس کے اندر پہنچ جائیں گے اور مزے کی بات یہ ہے کہ بھیڑ میں شامل لوگوں کو اس کا احساس تک نہ ہو گا کہ وہ آپ کو کسی سائنسی اصول کے مطابق ڈھو کر اندر لے گئے ہیں۔

مقصود منزل یعنی منزل مقصود آنے پر بس سے نکلنے کے لیے بھی اس سائنسی اصول کی مدد لی جا سکتی ہے۔ اس کے بعد اگر آپ کے کپڑے اور ہاتھ پیر صحیح سلامت بچ جائیں تو آرام سے دفتر یا گھر پہنچ جایئے اور اس خادم کے حق میں دعائے خیر کرتے رہیے۔

لوکل بس میں ہم اکثر اسی سائنسی طریقے سے سفر کرتے ہیں جس سے نہ صرف یہ کہ ہم کئی بار اپنی منزل تک پہنچ جاتے ہیں بلکہ ہمارے درزی اور محلے کے پہلوان خلیفہ امداد اللہ کی مدد بھی ہوتی رہتی ہے جو پہلے ہڈیاں توڑنے میں کمال رکھتے تھے، اب بڑھاپے میں ہڈیاں جوڑنے کا کام کرتے ہیں۔ ہاں، کبھی کبھی جیبوں کا صفایا بھی ہو جاتا ہے اور اس طرح بس میں سفر کرنے کا نتیجہ صفر ہاتھ آتا ہے۔ لیکن ہم یہ سوچ کر صبر کر لیتے ہیں کہ خدا نے سب کو رزق پہنچانے کا انتظام کر رکھا ہے لہٰذا ہم کون ہوتے ہیں اس کے نظام میں دخل دینے والے۔

اب ہم کچھ نکتے آپ کے ساتھ ساتھ ڈی ٹی سی (دہلی ٹرانسپورٹ کارپوریشن) کے منتظمین کے علم میں بھی لانا چاہتے ہیں اور کچھ ایسے مفید مشورے پیش کر رہے ہیں جن پر عمل ہو جائے تو مسافروں کے بہت سے مسئلے حل ہو جائیں گے اور وہ نہایت آرام سے سفر کر سکیں گے۔ (ڈی ٹی سی کے علاوہ دوسری بس سروسز کے منتظمین بھی ان مشوروں سے استفادہ کر سکتے ہیں۔ اس کے لیے مصنف سے تحریری اجازت لینے کی چنداں ضرورت نہیں)۔

سب سے بڑا مسئلہ بسوں میں داخلے کا ہوتا ہے۔ بس کے آتے ہی سارے مسافر اس کے دو عدد دروازوں پر پل پڑتے ہیں اور بڑی مشکل سے ایک ایک کر کے اندر داخل ہوتے ہیں جس سے بس کافی دیر تک رکی رہتی ہے، اور اس طرح نہ صرف بس کے اندر بیٹھے ہوئے سیکڑوں مسافروں کا بلکہ اس کے ڈرائیور کا بھی قیمتی وقت ضائع ہوتا رہتا ہے۔

اس پریشانی سے بچنے کا سب سے آسان طریقہ یہ ہے کہ بس کے دروازوں کی تعداد بڑھا دی جائے۔ بسوں میں داخل ہونے کے دروازے دائیں بائیں آگے پیچھے ہر طرف ہوں۔ بلکہ اگر سامنے کی طرف انجن کی جگہ اور چھت میں بھی ایک ایک دروازہ بنا دیا جائے تو اچھا رہے۔ مسافروں کی مزید

مشورے 111
قسمت کے کھیل نرالے 116
چلتی کا نام گاڑی 121
ایک مباحثے کی پیروڈی 129
وزن اپنا اپنا 133
کچے رنگ 138
تعلیم بالغاں 140
تیسرا کان 143
چینی، مصری اور شکر 146
لمبا رام 148
غریبی کی سطح کے نیچے 151
ایک گدھا بوٹ کلب پر 153
سارے جہاں سے اچھا 155
اداسی 158

سہولت کے لیے کھڑکیوں کو یا تو اور کشادہ کر دیا جائے یا ان کے شیشے اور حفاظتی ڈنڈے نکال دیئے جائیں تاکہ ضرورت پڑنے پر انہیں بھی بطور دروازہ استعمال کیا جاسکے۔ اس طرح بس میں مسافر ہر طرف سے داخل ہو سکیں گے اور اسٹاپ پر رکتے ہی بلکہ کبھی کبھی تو رکنے سے پہلے ہی بس آنا" فانا" مسافروں سے بھر جایا کرے گی' اور کسی کا بھی وقت ضائع نہیں ہوگا۔

یہاں ایک تکنیکی سوال ضرور آپ کے ذہن میں پیدا ہوگا اور وہ یہ کہ اگر سامنے کی طرف انجن کی جگہ بھی ایک دروازہ بنا دیا گیا تو انجن کہاں رکھا جائے گا اور بس کیسے چلے گے؟ تو اس کا حل بھی بڑا آسان ہے جو یہ ہے کہ انجن کو بس کے پیچھے ٹرالی جوڑ کر اس میں رکھ دیا جائے۔ مسافروں سے بھری ہوئی بس اپنے آپ ٹرالی کو کھینچتی رہے گی اور انجن چلتا رہے گا۔ اس کا ایک اضافی فائدہ یہ ہوگا کہ مسافر انجن کے شور سے بھی محفوظ ہو جائیں گے۔

یہ تو ہوا بس میں داخل ہونے کا معاملہ! اب رہ جاتا ہے بس سے نکلنے کا مسئلہ۔ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ مسافر حضرات بس میں داخل ہونے کی بہ نسبت بس سے نکلنے میں زیادہ دیر لگاتے ہیں۔ اس مشکل کا ایک حل یہ ہے کہ مسافروں کو اپنا اسٹاپ آنے سے پہلے چھت کے دروازے سے چھت پر چڑھ جانے کو کہا جائے اور اسٹاپ آتے ہی مسافر وہاں سے نیچے چھلانگ لگا دیا کریں۔ لیکن اس میں دو قباحتیں ہیں۔ اول یہ کہ کئی مسافر زخمی بھی ہو سکتے ہیں اور دوئم یہ کہ زخمی ہونے والے مسافروں کی فرسٹ ایڈ کے لیے انتظامیہ کو ہر اسٹاپ پر ڈاکٹر اور کمپاؤنڈر کا انتظام کرنا پڑے گا جس سے سرکاری خزانہ پر کافی بوجھ پڑ جائے گا۔

لہٰذا زیادہ بہتر طریقہ یہ ہے کہ مسافروں کے اخراج کے لیے ایک بڑا دروازہ بس کے فرش میں بنا دیا جائے۔ جیسے ہی اسٹاپ آئے' مسافر اس راستے سے براہ راست سڑک پر اتریں اور بس کی روانگی سے پہلے صحیح سلامت اس کے نیچے سے نکل آئیں۔ بلکہ اس عمل کو اور آسان بنانا ہو تو فرش کے دروازے کو خود کار ہائڈ رولک نظام سے بھی جوڑا جا سکتا ہے۔ جیسے ہی اسٹاپ آئے گا ڈرائیور ایک بٹن دبا دے گا اور فرش کا دروازہ اپنے آپ کھلتے ہی اس کے اوپر کھڑے ہوئے مسافر خود بخود نیچے پہنچ جائیں گے۔ اس کے بعد انہیں نیچے سے رینگ کر نکلنے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ چپ چاپ سڑک پر پڑے رہیں۔ بس اوپر سے خود بخود نکل جائے گی اور بچے کھچے مسافر سڑک سے اٹھ کر بہ آسانی اپنی اپنی مقصود منزل کو روانہ ہو جائیں گے۔

اب آیئے بس کے اندر کی سہولتوں کی طرف۔ اس سلسلے میں ہمارا بے حد مفید مشورہ یہ ہے کہ بسوں کے اندر سیٹیں لگانے کا فرسودہ رواج اب ختم کر دیا جانا چاہیے۔ سیٹوں سے مسافروں کو آرام ملنے کی بجائے تکلیف زیادہ ہوتی ہے اور کبھی کبھی تو جھگڑے بھی ہو جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ کھڑے ہوئے

مسافروں کے لیے راستے کی رکاوٹ بھی بن جاتی ہیں۔ سیٹیں نہیں ہوں گی تو نہ کوئی تکلیف ہوگی' نہ جھگڑا کھڑا ہوگا۔ بس لوگ کھڑے رہیں گے۔ نہ کوئی چھوٹا ہوگا نہ بڑا۔ نہ محمود نہ ایاز۔ سب کے سب ایک بس میں کھڑے ہو جائیں گے۔

سیٹیں لگانے سے بہتر یہ ہوگا کہ بسوں کے اندر اور باہر ڈنڈوں کی تعداد بڑھا دی جائے۔ اندر اس لیے کہ زیادہ سے زیادہ لوگ انہیں پکڑ کر جھول سکیں۔ اور باہر اس لیے کہ بس کے باہر لٹکنے والوں کو زیادہ سہولت ہو جائے۔ تاہم یہ انتظام کرتے وقت منتظمین کا فرض ہے کہ وہ ضعیفوں اور معذوروں کا خاص خیال رکھیں اور ان کے لیے ڈنڈے خاص طور پر مخصوص کر دیئے جائیں جن پر کسی اور کو لٹکنے کی قطعی اجازت نہ ہو۔

اس کے بعد بھی انتظامیہ سیٹیں لگانے پر مصر ہو تو بہتر یہ ہوگا کہ اندر کی تمام سیٹیں چھت پر لگا دی جائیں تاکہ وہاں کے مسافروں کو بھی کچھ آرام مل سکے۔ آزادی ملنے کے... برس بعد بھی (قارئین خود حساب جوڑ لیں) اگر ہم بسوں اور ریلوں کی چھتوں پر سفر کرنے والوں کو سیٹ مہیا نہیں کر سکتے تو لعنت ہے ان چھتوں پر!

اس میں کوئی شک نہیں کہ دہلی کی سڑکوں پر سب سے زیادہ حادثے کرنے کی ذمہ داری دہلی کی لوکل بسیں پورا کرتی ہیں۔ ماضی میں ڈی ٹی سی کی بدولت اور آج کل ریڈ لائن سروس کی بدولت دہلی کی لوکل بسوں کو بڑے شہروں کی سب سے خطرناک لوکل بسوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ ماضی میں ڈی ٹی سی کی سبز اور پیلے رنگ والی بسوں کے ہاتھوں (بلکہ پہیوں) ہر سال کم از کم ۳۶۵ افراد لقمہ اجل بن جاتے تھے (لوند کے سال میں یہ تعداد ۳۶۶ رہتی تھی)۔ آج کل ریڈ لائن سروس کی خطرناک سرخ بسوں کی مہربانی سے یہ تعداد کافی بڑھ گئی ہے۔

شاید ہی دہلی میں کوئی دن ایسا جاتا ہو جب کہیں نہ کہیں کوئی نہ کوئی جان لیوا حادثہ ان سرخ رنگ کی سبز قدم بسوں کی وجہ سے نہ ہوتا ہو۔ کہیں یہ ڈی ٹی سی کی بس کا پیچھا کرتے کرتے فٹ پاتھ پر چڑھ جاتی ہیں تو کہیں پل سے لٹک جاتی ہیں۔ بد چلن ایسی ہیں کہ کبھی کسی سائیکل کو کہنی مار دی' کبھی کسی اسکوٹر کے پیٹ میں گدگدی کر دی' کہیں کسی ٹرک کی چٹکی بھر لی' کسی ماروتی کو تنہا پا کر بوسہ لے لیا' کسی ریڑھی کو چپت لگا دی--- اور آوارہ ایسی کہ اسٹاپ کو چھوڑ کر باقی جس جگہ چاہا رک گئیں' جدھر چاہا چل پڑیں۔ نتیجہ یہ کہ آئے دن حادثے ہوتے رہتے ہیں اور لوگ مرتے رہتے ہیں۔

لیکن دیکھا جائے تو یہ تصویر کا صرف ایک رخ ہے۔ دوسرے پہلو سے دیکھا جائے تو دہلی کی لوکل بسیں' صرف ان لوگوں کے لیے خطرناک نظر آئیں گی جو ان کے باہر ہیں۔ جو اندر ہیں' یعنی ان میں سفر پذیر ہیں' ان کے لیے دہلی میں اس سے زیادہ محفوظ کوئی سواری نہیں ہے۔ کوئی باہر والا سامنے آجائے تو

یہ اسے روند کر رکھ دیں گی۔ لیکن جو ایک بار ان کی کلائی تھام کر اندر آگیا تو سمجھ لیجئے کہ وہ جیب کتروں کے سوا دنیا کی ہر آفت سے محفوظ ہوگیا۔ اب نہ طوفان بادوباراں اس کا کچھ بگاڑ سکتا ہے نہ کوئی زلزلہ نقصان پہنچا سکتا ہے۔ اس پہلو سے غور کیجئے تو لوکل بسوں کی خارجہ پالیسی جس قدر جارحانہ اور سفاک نظر آئے گی داخلہ پالیسی کو آپ اتنا ہی رحم دل اور متعدل پائیں گے اور لگے ہاتھوں آپ کو ایران کی خارجہ اور لبنان کی داخلہ پالیسی کا فرق بھی معلوم ہو جائے گا۔

تاہم لوکل بسوں کی داخلہ پالیسی سب جگہ ایک سی نہیں ہوتی۔ سینٹر کی 'یعنی بیچ کی پالیسی الگ ہوتی ہے' اگلے اور پچھلے حصوں کی کچھ اور ہوتی ہے اور پچھلے یعنی داخلی دروازے کی سب سے مختلف! خود ڈی ٹی سی اور ریڈ لائن بسوں کی داخلہ پالیسیاں بھی آپس میں میل نہیں کھاتیں۔

ڈی ٹی سی کی داخلہ پالیسی کلی طور پر ڈرائیور کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ ڈرائیور چاہے تو آپ بس میں چڑھ سکتے ہیں۔ ڈرائیور نہ چاہے تو آپ لاکھ چلائیے 'بس کو تھپتھپائیے' کنڈکٹر کو گالیاں دیجئے' بس نہیں رکے گی۔ ڈی ٹی سی کی بسیں ڈرائیور کے موڈ کے مطابق ٹھہرتی اور روانہ ہوتی ہیں بلکہ آپ چاہیں تو بس کی چال دیکھ کر ڈرائیور کے حال اور موڈ کا اندازہ بھی لگا سکتے ہیں۔ مثلاً اگر بس اپنے مقررہ اسٹاپ پر رکے بغیر چلی گئی ہے تو سمجھ لیجئے کہ اگلی سیٹ پر کوئی حسین سواری بیٹھی ہے اور ڈرائیور کی نظر سڑک پر نہیں بلکہ عقبی آئینے پر ہے جس میں حسین سواری کا عکس دیکھ کر وہ یقینی طور پر گنگنا رہا ہوگا۔۔ "گڈی جاندی اے چھلانگاں مار دی۔ مینوں یاد آئے میرے یار دی!" اسی طرح اگر بس اپنے اسٹاپ پر رکنے کی بجائے کبھی بہت آگے اور کبھی بہت پیچھے رکتی ہو تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ یا تو ڈرائیور کا اپنی بیوی سے جھگڑا ہوگیا ہے یا پھر وہ اس روٹ پر نیا بدلی ہوا ہے اور کنڈکٹر اتفاق سے ہکلا مل گیا ہے۔

اور اگر بس ہر اسٹاپ پر ٹھیک جگہ رک رہی ہو (جو لگ بھگ ناممکن ہے) تو سمجھ لیجئے کہ ڈرائیور اور کنڈکٹر میں کسی بات پر کھٹ پٹ ہوگئی ہے اور دونوں ایک دوسرے پر غصہ اتار رہے ہیں۔

بس یہ تیسری صورت حال ہے جس میں آپ ڈی ٹی سی بس پر بہ آسانی سوار ہو سکتے ہیں۔ پہلی دو حالتیں آپ کے لیے نہیں ہیں۔ کیونکہ پہلی حالت میں (جب ڈرائیور کو عقبی آئینے میں حسینہ نظر آرہی ہو) آپ صرف اس صورت میں بس پر سوار ہو سکتے ہیں جب آپ کسی گھوڑے' اسکوٹر یا کار کی چھت پر سوار ہوں اور آپ کا موڈ ڈی ٹی سی بس میں دھکے کھانے کا ہو رہا ہو اور یہ بھی کہ آپ نے فلم گنگا جمنا میں دلیپ کمار کو دوڑتے گھوڑے سے چلتی ٹرین پر چڑھتے ہوئے دیکھ لیا ہو۔

دوسری صورت حال میں آپ کا وہ حال ہوگا جو ایک دن ہمارا ہوا تھا۔ یہ واقعہ از منہ ریڈ لائن سے پہلے کا ہے۔ اس روز غالباً دہلی کے تمام ڈی ٹی سی ڈرائیور اپنی بیویوں سے لڑ بیٹھے تھے۔ ہم گھر سے دفتر جانے کے لیے بس اسٹاپ پر پہنچے تو جس بس سے جانا تھا وہ اسٹاپ سے کافی آگے جا کر رک گئی۔ ہم لپکے۔

لیکن تبھی بس چل پڑی۔ پھر ہم دوڑے تو بس ہوا ہو گئی اور ہم دوڑتے دوڑتے اگلے اسٹاپ پر پہنچ گئے۔ وہاں بھی ایک بس اسی طرح اسٹاپ سے آگے جا کر رکی۔ اسے پکڑنے کی کوشش کی تو وہ بھی نکل گئی اور ہم بس کے پیچھے بھاگتے بھاگتے تیسرے اسٹاپ پر جا پہنچے۔ آگے بھی یہی ہوا اور یقین جانئے کہ ہم یوں ہی دوڑتے دوڑتے، بس سے پہلے دفتر پہنچ گئے۔ مگر بس ہاتھ نہیں آئی۔

اسی روز شام کو دفتر سے گھر روانہ ہوئے تو جو بھی بس آئی وہ اسٹاپ سے پہلے رک گئی۔ پھر ان بسوں کو پکڑنے کی کوشش کی تو صبح جو کچھ ہوا تھا اس کا الٹ ہونے لگا اور ہم پچھلے سے پچھلا بس اسٹاپ طے کرتے ہوئے پندرہ منٹ میں گھر کے بجائے گوالچہ سینما جا پہنچے۔ رک کر دم درست کیا تو کیا دیکھتے ہیں کہ میاں عبدالقدوس وہاں ہم سے پہلے ہی کھڑے ہیں۔ ہمیں دیکھتے ہی بولے۔

"اچھا تو یہ بات ہے۔ آج پکڑے گئے ہو! اب معلوم ہوا کہ حضور روزانہ دفتر سے گھر جانے کی بجائے کہاں باغوں کی فلمیں دیکھنے جاتے ہیں۔ شرم آنی چاہیے تمہیں۔ تمہارے والد کی لوگ اتنی عزت کرتے ہیں اور تم ان لغویات میں اپنی رقم اڑاتے پھر رہے ہو۔ لاحول ولا قوۃ۔ استغفر اللہ بلکہ انا للہ...."

خاں صاحب ابھی اور نہ جانے کیا کیا کہنے والے تھے کہ ہم نے ہاتھ جوڑ لئے، ہانپتے ہانپتے انہیں سارا قصہ سنایا اور درخواست کی کہ للہ اب گھر واپس جانے کی کوئی تدبیر بتا دیجئے۔ سن کر خاں صاحب پہلے متغیر، پھر متحیر، پھر متفکر اور بالآخر متبسم ہو کر بولے۔

"گھر پہنچنا کون سا مشکل ہے۔ گھر کی طرف سے جو بسیں یہاں آ رہی ہیں ان پر چڑھنے کی کوشش کرو۔ ظاہر ہے وہ اسٹاپ سے پہلے رکیں گی۔ تم انہیں پکڑو گے تو پھر پچھلے اسٹاپ پر جا پہنچو گے اور یوں علم ریاضی کی رو سے انشاء اللہ چترہار شروع ہونے تک گھر پہنچ جاؤ گے!"

ہم نے خاں صاحب کی ہدایت پر حرف بہ حرف عمل کیا اور ایک پھر یقین جانئے کہ جب ہم گھر پہنچے تو چترہار کا پسلا گانا چل رہا تھا۔

"گڈی جاندی اے چھلانگاں ماردی....."

بہرحال ذکر ہو رہا تھا ڈی ٹی سی اور ریڈ لائن بسوں کی داخلہ پالیسی کا اور اس بات کا کہ دہلی کی لوکل بسیں کس قدر محفوظ واقع ہوئی ہیں۔ ہوائی جہاز گر جائے یا ٹرین الٹ جائے تو سیکڑوں لوگ مارے جاتے ہیں۔ ٹرک یا ٹریکٹر ٹرالی پلٹ جائے تب بھی درجنوں موقع پر ہلاک ہو جاتے ہیں۔ رکشہ یا سائیکل لڑھک جائے تو ہڈی پسلی ٹوٹ جاتی ہے۔ تانگہ الٹ جائے تو کم از کم سر پھوٹ جاتا ہے۔ غرضیکہ دنیا کی کوئی سواری ایسی نہیں جسے آپ محفوظ ترین کہہ سکیں۔

اس کے برعکس دہلی کی لوکل بس چاہے فٹ پاتھ پر چڑھ جائے، چاہے الٹ کر گڑھے میں گر جائے،

مسافروں کی جان کو کوئی خطرہ نہیں رہتا۔ یہاں تک کہ اگر کسی دوسری لوکل بس سے بھی ٹکرا جائے تو عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ دونوں بسوں کے مسافر خوشی کے مارے یا ہو' کا نعرہ لگاتے ہوئے باہر نکل کر ایک دوسرے سے بغل گیر ہو جاتے ہیں اور ایک بس کا ڈرائیور دوسری بس کے ڈرائیور کو بیڑی پیش کرتے ہوئے کہتا ہے---

"اور سنا بھئی شیر سنگھ صاحب! کیا حال ہیں تیرے؟ بڑے دنوں بعد بھینٹ ہوئی۔ میں تو آج تجھے یاد بھی کر رہا تھا۔"

ایک روز خبر ملی کہ مسافروں سے بھری ایک ڈی ٹی سی بس جمنا میں گر گئی ہے۔ اخبار والے دوڑے دوڑے آئی ٹی او پل پر پہنچے تو پایا کہ بس پل کی ریلنگ سے جمنا میں لٹکی ہوئی تھی۔ ڈرائیور اور کنڈکٹر بس پر پیر رکھ کر فوٹو کھنچوا رہے تھے اور مسافر مزے سے جمنا میں اشنان کرتے ہوئے ایک دوسرے سے کہہ رہے تھے---

"بھئی واہ۔ ایک روپے میں بس کی سواری بھی اور جمنا جی میں اشنان بھی! اسے کہتے ہیں ایک ٹکٹ میں دو مزے۔"

اور اب آخر میں دہلی کی منی بسوں کا ذکر ضروری ہے۔ کیونکہ جس طرح پنجاب کے لوگ اکثر کہا کرتے ہیں کہ جس نے لاہور نہیں دیکھا وہ پیدا ہی نہیں ہوا' اسی طرح دہلی کی منی بسوں کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ جس نے دہلی کی منی بسوں میں سفر کیا ہے وہ پیدا کیوں ہوا ہے اور ابھی تک زندہ کیوں ہے۔ کچھ اور لوگ کہتے ہیں کہ جس نے منی بسوں میں سفر نہیں کیا وہ دہلی والا ہی نہیں۔ اس نے دہلی ہی نہیں دیکھی۔ سچ بھی ہے' جب تک آدمی کی قمیص نہ پھٹے' جیب نہ کٹے' اور کوئی ہڈی اپنے جوڑ سے نہ ہٹے تب تک وہ کیسے کہہ سکتا ہے کہ میں نے دہلی دیکھی ہے۔ قمیص کی سلائی سے لے کر جسم کی ہڈیوں تک جس کا ہر جوڑ سلامت رہتا ہو وہ اپنے کو قصبہ پہاسو' موضع پور قاضی یا سنہری کھڑکھڑی کا باشندہ تو کہہ سکتا ہے' دہلی کا نہیں۔ کیونکہ اول الذکر مقامات پر آج تک کوئی منی بس نہیں چلی اور موخر الذکر شہر کو دیکھنے سے ایسا لگتا ہے کہ منی بسیں یہاں پہلے ایجاد ہوئی ہوں گی' شہر بعد میں۔

یوں تو دہلی میں ڈی ٹی سی کی بسیں بھی چلتی ہیں ایس ٹی اے کی بھی' ٹیکسیاں بھی چلتی ہیں تھری وہیلر بھی' مگر جو نرالی شان منی بسوں کی ہے وہ کسی کی نہیں۔ پٹ پڑ گنج ریلوے لائن پر کوئی بم پھٹ جائے' تو منڈاولی اور پریت وہار میں بھی کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوگی۔ لیکن لال قلعہ سے چڑیا گھر کے لیے کوئی منی بس روانہ ہو جائے تو پورے شہر کو پتہ چل جائے گا کہ لیجئے صاحب' شاہجہاں بادشاہ کے مکان سے ایک آندھی رسینہ کی طرف چل پڑی ہے۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ منی بسوں میں سائلنسر فٹ نہیں ہوتا۔ یا ہوتا ہے تو خود بھی بولتا رہتا ہے۔ بلکہ یہ ہے کہ اس کے تمام کنڈکٹر ایک ساتھ گلا پھاڑ کر مسافروں کو آواز

لگاتے رہتے ہیں۔

جی ہاں' بڑی بس کا ایک کنڈکٹر ہوتا ہے۔ مگر منی بس کئی کنڈکٹروں سے چلتی ہے اور کبھی کبھی ڈرائیور بھی اپنی سیٹ پر بیٹھا کنڈکٹری کرتا رہتا ہے۔ بلکہ بعض منی بسوں میں تو چھت کا بھی ایک الگ کنڈکٹر ہوتا ہے۔ خیر' ان کنڈکٹروں کا کورس عام طور پر یوں ہوتا ہے کہ --- "چل دریا گنج' دہلی گیٹ' آئی ٹواو' پرگتی میدان' چڑیا گھر' نظام الدین' مہرولی...."

اب اگر آپ کسی کنڈکٹر سے یہ پوچھیں کہ بھائی بس پر تو صرف لال قلعہ سے چڑیا گھر لکھا ہے' پھر نظام الدین اور مہرولی کیسے پہنچا دو گے؟ تو وہ بتیسی نکال کر کہے گا۔ "بھائی صاحب۔ آپ چلئے تو سہی۔ جہاں کہو گے پہنچا دیں گے۔" یہ اور بات ہے کہ وہ چڑیا گھر آنے سے پہلے ہی آپ کو کسی بس اسٹاپ پر جھڑک کر اتار دے گا اور کہے گا "جا۔ یہاں سے چلا جا مہرولی۔ کئی بسیں مل جائیں گی۔" اور یوں آپ شام تک مہرولی پہنچ جائیں گے۔

منی بس میں ڈرائیور کنڈکٹر کلینر وغیرہ کے طور پر جو عملہ ساتھ چلتا ہے وہ مسافروں کا اس قدر خیال رکھتا ہے کہ کچھ نہ پوچھئے۔ سڑک پر کھڑا کوئی بھی آدمی ہاتھ سے اشارہ کردے منی بس کا ڈرائیور ایک جھٹکے میں بس روک دے گا۔ چاہے ایسا کرنے سے بس کے اندر' آگے کے مسافر پیچھے اور پیچھے کے مسافر آگے ہی کیوں نہ آجائیں۔ کنڈکٹر اور کلینر حضرات اسے پوری جانفشانی سے بس پر سوار کرائیں گے۔ چاہے اسے سائلنسر پر ہی کیوں نہ بٹھانا پڑے۔ اسی طرح بھیڑ میں پھنسے مسافر کو ٹکٹ لینے کے لیے کنڈکٹر کے پاس جانے کی بھی ضرورت نہیں۔ وہ خود ہی ایک دو مسافروں کے پیر کچل کر دو تین کی ہڈیاں چٹخا کر اور تین چار کو کندھے سے دھکیل کر اس تک پہنچ جائے گا اور اس پر محاورے میں نہیں سچ مچ سوار ہو کر ٹکٹ بنا دے گا۔

منزل مقصود آنے پر آپ مسافروں کی بھیڑ میں سب سے پیچھے پھنسے ہوں تو بس کے واحد دروازے تک پہنچنے کی سعی کرنا ضروری نہیں۔ درخواست کرنے پر کنڈکٹر خود ہی آپ کو کھڑکی کے راستے باہر پھینک دے گا۔

اگر کوئی منی بس چلنے سے پہلے خالی کھڑی ہو' یعنی اس کی صرف سیٹوں اور بیچ کی خالی جگہوں پر مسافر موجود ہوں اور چھت خالی ہو تو عملہ کا اخلاق دیکھنے کے لائق ہوتا ہے۔ بس کوئی آدمی بس کے قریب سے گذرنا چاہئے۔ مجال ہے جو یہ لوگ اسے کہیں نہ کہیں لے نہ جائیں۔

ایک شام ہم کسی مصرعہ پر گرہ لگاتے ہوئے سڑک پر جا رہے تھے۔ جیسے ہی مصرعہ لگا بے ساختہ منہ سے واہ نکلی اور دایاں ہاتھ داد لینے کے انداز میں آگے کی طرف اٹھ گیا۔ یہ دیکھتے ہی ایک تقریباً خالی منی بس ہمارے نزدیک آکر رک گئی۔ ہم اچک کر فٹ پاتھ پر چڑھ گئے۔ مگر بس کے کنڈکٹر اور اسسٹنٹ

کنڈکٹروں نے ہمیں دونوں طرف سے پکڑلیا۔ بولے۔ "آیئے صاحب آیئے۔ چڑیا گھر چلئے۔"

"نہیں بھئی۔ ہمیں چڑیا گھر نہیں جانا ہے۔"

"چڑیا گھر نہیں تو کہاں جائیں گے؟"

"ہمیں کھچڑی پور جانا ہے' شام کو وہاں طرحی شعری نشست ہے۔"

انہوں نے ہمیں سر سے پاؤں تک غور سے دیکھا' آنکھوں آنکھوں میں کچھ اشارے کیے پھر ان میں سے ایک بولا "کوئی بات نہیں۔ کھچڑی پور بھی جائے گی۔ ہمارا ڈرائیور وہیں رہتا ہے۔"

پھر اس سے پہلے کہ ہم کچھ کہہ پاتے انہوں نے مل کر ہمیں اوپر اٹھایا اور بس کی چھت پر چڑھا دیا۔

کھچڑی پور ہم رات کو اس وقت پہنچے' جب ڈرائیور موصوف بس کے تمام ٹرپ پورے کرنے اور ڈھابے پر دیسی چڑھانے کے بعد نشہ ڈھیلا ہونے پر بس چلانے کے لیے رضامند ہوئے اور شعری نشست میں صدر صاحب اپنی آخری غزل کا مقطعہ پڑھ رہے تھے!

☆ ☆ ☆

فرہنگ جدید انگریزی اردو

عرصہ سے ہم یہ سوچ سوچ کر پریشان ہو رہے تھے کہ ایک طرف بابائے اردو مولوی عبدالحق کی مرتب کردہ انگریزی اردو ڈکشنری عرصہ ہوا تاریخ باہر ہو چکی ہے اور دوسری طرف ترقی اردو بیورو نے قسم کھا رکھی ہے کہ حکومت سے لاکھوں روپے لے کر اس نے جو نئی انگریزی اردو لغت مرتب کرائی ہے، وہ اسے اگلی صدی میں اس وقت سے پہلے منظرعام پر نہیں لائے گا جب تک اس ملک سے اردو کا جنازہ نہیں نکل جاتا اور یہ ڈکشنری بھی آؤٹ آف ڈیٹ نہیں ہو جاتی۔

تو ہم یہ سوچ رہے تھے کہ آخر اردو قوم کا کیا ہو گا؟ جب تک اردو کا جنازہ نکلے گا تب تک لوگ باگ کس کے سہارے رہیں گے؟ اردو اخباروں کے نیوز ڈیسک پر ترجمے کے دوران نئے انگریزی الفاظ کے معانی اور مرادفات پر ہر روز ہونے والے لسانی جھگڑے کیسے طے ہوں گے؟ انگلش میڈیم اسکولوں میں بڑھنے والی نئی نسل کو سالے اور بہنوئی کا فرق کیسے معلوم ہو گا وغیرہ وغیرہ؟

ہم یہ سب سوچ سوچ کر پریشان ہو ہی رہے تھے کہ ایک دن ہاتف نے صدا دی، اٹھ میاں اور ترقی اردو بیورو کی ڈکشنری چھپنے اور اردو کا جنازہ نکلنے سے پہلے ایک عبوری ڈکشنری تیار کر کے چھاپ دے، جس میں نہ صرف نئے دور کے نئے الفاظ شامل ہوں بلکہ پرانے لفظوں کے نئے معنی بھی دیے گئے ہوں، جس کی کمی سے بابائے اردو کی نصف صدی پرانی ڈکشنری فرسودہ ہو گئی ہے۔

میاں ہاتف سلمہ، کا یہ کہنا تھا کہ ہم اٹھے، ڈکشنری پر کام شروع کیا اور انتہائی کاوش و جاں کاہی سے زمانے بھر کی مصیبتیں اٹھائے اور دنیا بھر کی سختیاں جھیلے بغیر، ایک ہفتے کی صبر آزما مدت میں ایک ایسی جامع ڈکشنری تیار کر لی کہ جو بھی اس کا مسودہ دیکھتا ہے دیر تک عش عش، عش عش کرتا رہتا ہے۔ چونکہ

ڈکشنری کی اشاعت باسعادت کے لیے پبلشر کی تلاش ہنوز جاری ہے اور کام یہ آج کے دور میں سخت بھاری ہے' اس لیے اس نسخہ لاجواب و گنجینہ افراسیاب کے بالواسطہ سے بلاواسطہ اور زیور طبع سے آراستہ ہونے (مطلب یہ کہ چھپنے) نیز عوام و خواص تک اس کے پہنچنے میں ابھی وقت لگے گا۔ چنانچہ رفاہ خاص و عام و فلاح عام و خاص کے لئے تک اس کے چند اقتباسات بطور مشتے از خروارے' من جانب مرتب کم ترین' ہدیہ ناظرین و قارئین کئے جارہے ہیں۔

نوٹ' یعنی تنبیہہ' یعنی خبردار! : اس لغت میں حروف تہجی کی ترتیب اردو کے مطابق و مسابق رکھی گئی ہے تاکہ یہ عام انگریزی اردو لغات سے الگ رہے جن میں لفظ نمونیہ "پ" کے تحت' لفظ چاقو (ناائف) "ک" کے تحت اور لفظ رائٹر "و" یعنی ڈبلیو کے تحت لکھا جاتا ہے۔

ایکسیڈینٹ : اتفاقی حادثہ۔ یعنی حادثاتی اتفاق' یا محض حادثہ' یا محض اتفاق۔ مثلاً شادی میں کم جہیز لانے والی عورت کا جل کر مرجانا' ڈرائیونگ پارٹی سے واپس جانے والوں کی کار کا فٹ پاتھ پر سوئے ہوئے لوگوں کے اوپر چڑھ جانا' پچاس سال کی گارنٹی کے معاہدے پر بنائے گئے پل کا دوسرے سال گر جانا' ٹھیکیدار کی موجودگی میں نالا کھودتے وقت مزدوروں کا مٹی کے تودے میں دب جانا' اتفاق سے کسی ٹرین کا پٹڑی سے اتر جانا' اتفاقاً" بس کا کھڈ میں گر جانا۔ مخصوص حالات میں خودکشی اور قتل کی وارداتوں کو بھی حادثہ کہا جاسکتا ہے۔ تاہم انہیں غیر اتفاقی حادثہ کہنا زیادہ فصیح ہے۔

اکادمی : (۱) وہ ادارہ جو عموماً" زبان یا ادب کی ترقی کے لیے بنایا جاتا ہے۔ اس ادارے کے بغیر کوئی زبان ترقی نہیں کرسکتی۔ اور اگر کرلے تو اس کی خوب پٹائی کرنی چاہئے۔ کئی لوگ کہتے ہیں' اردو کے اب تک ترقی نہ کرنے کی وجہ یہی اردو اکادمیاں ہیں۔ ایسی باتوں کی طرف دھیان نہیں دینا چاہئے۔

(۲) وہ ادارہ جو ایک آدمی کے لیے بنایا جائے' جس میں ایک آدمی کی من مانی چلتی ہو' یا جس کی تقریبات میں صرف ایک آدمی چھایا رہے۔ چنانچہ ایک + آدمی = ایکادمی یا اکادمی۔

الیکشن : انتخاب۔ وہ عمل جس کے دوران عوام سے حیرت انگیز اور ناقابل یقین وعدے کیے جائیں' جلسے جلوسوں میں روپیہ کی طرح پانی بہایا جائے' رائے دہندگان میں شراب اور کمبل تقسیم ہوں' اور پھر اوپر سے تھوپا گیا امیدوار فائرنگ اور پولنگ بوتھ پر قبضہ کی وارداتوں کے بعد پرامن طور پر آبادی کے نصف در نصف حصہ کی اکثریت کی رائے سے' کارپوریشن' اسمبلی یا پارلیمنٹ میں اس کا نمائندہ چن لیا جائے۔

اسمبلی : دیکھو پارلیمنٹ یا کارپوریشن۔

بجٹ : نئے زمانے کا وہ لفظ جس سے سب ڈرتے ہیں۔ جس کا ذکر آتے ہی بازاروں سے چیزیں

غائب ہوجاتی ہیں، مگر ہستین بچوں کا دودھ آدھا کردیتی ہیں، دکاندار ضروری اشیاء گوداموں میں چھپالیتے ہیں۔ ایک مشہور فلم میں اس چیز کا نام گبرسنگھ بتایا گیا ہے جو کہ غلط ہے۔ بجٹ عموماً دو طرح کے ہوتے ہیں۔ مرکزی بجٹ اور ریاستی بجٹ۔ تاہم غریب کی کمر دونوں سے جھک سکتی ہے۔

برطانیہ : یوروپ کا ایک سرد ملک جس کی حکومت میں کبھی سورج غروب نہیں ہوتا تھا، آج کل طلوع نہیں ہوتا (خاص کر سردی کے دنوں میں)۔ بعض ماہرین کے مطابق اس ملک کا نام برطانیہ بسکٹ سے متاثر ہوکر رکھا گیا جو ہندستان میں اصلی اور نقلی دونوں طرح کے بنتے ہیں اور شوق سے کھائے جاتے ہیں۔

بوگس : بناوٹی، غیر حقیقی، جھوٹا (یا جھوٹی)، مصنوعی۔ تمام لغات میں اس لفظ کی یہی تعریف کی گئی ہے۔ مگر حیرت کی بات ہے کہ لوگ بناوٹی کو بناوٹی، غیر حقیقی کو غیر حقیقی، جھوٹے کو جھوٹا اور مصنوعی کو مصنوعی کہتے ہیں، بوگس نہیں کہتے۔ یہاں تک کہ مصنوعی سیارے کو بوگس سیارہ اور مصنوعی دانت کو بوگس دانت بھی کوئی نہیں کہتا۔ زیادہ سے زیادہ نقلی دانت کہہ دیتے ہیں بس! ویسے یہ چاروں تعریفیں بعض سیاست دانوں اور ان کے بیانات وغیرہ پر بہ آسانی منطبق ہوجاتی ہیں۔ لیکن انہیں بوگس کہنے سے پہلے احتیاطاً دو تین مرتبہ سوچ لینا چاہیے۔ زیادہ محتاط قارئین چار بار سوچ لیں۔

بم : ایک دھماکے دار شئے، جس کا استعمال عموماً تخریب کے لیے کیا جاتا ہے۔ حیدر آباد دکن کی طرف سے شائع ہونے والی ایک لغت میں جس کی کتابت بھی غالباً کسی حیدر آبادی نے کی ہوگی، لکھا ہے کہ بم وہ دھماکے دار شئے ہے، جس کا استعمال تخریب اور تخریب میں ہوتا ہے۔ یہاں غالباً دوسری تخریب سے کاتب کی مراد ہے تقریب (ہوسکتا ہے پہلی سے ہو)۔ یہ درست ہے کہ کئی بڑی تقریبات، مثلاً تاج پوشی، شادی بیاہ وغیرہ کی شروعات پر بم چھوڑے جاتے ہیں یا بندوق داغی جاتی ہے تاکہ دھماکہ ہو اور سب خبردار ہوجائیں۔ اردو میں اس لفظ کا استعمال زیرو بم کی شکل میں ہوتا آیا ہے۔ مگر افسوس، اس سے کوئی دھماکہ نہیں ہوتا۔ پتہ نہیں اسے زیرو بم کی بجائے صفر بم کیوں نہیں کہتے۔ یہ بھی افسوس کی بات ہے۔

پارلیمنٹ : دیکھو اسمبلی، پھر دیکھو کارپوریشن۔

پولس : خاکی وردی پہننے والی ایک عجیب و غریب مخلوق، جو ہر کام ڈنڈے سے کرتی ہے اور جس کا فرض قانون کی حفاظت کرنا ہوتا ہے۔ اس فرض کو یہ مخلوق بڑی مستعدی سے ادا کرتی ہے اور ادائے فرض کے لیے کسی قانون کی پرواہ نہیں کرتی۔ مائیں اس کا نام لے کر بچوں کو چپ کراتی ہیں۔ کچھ جگہوں پر اس مخلوق کو سنتری جی (بروزن منتری جی) کہا جاتا ہے۔ بھری ہوئی جیب کا یہ قوم بے حد احترام کرتی ہے۔ چنانچہ حضرت ساحر لدھیانوی ایک فلم میں فرما گئے ہیں۔

پیش لفظ

یہ چند سطریں لکھنے بیٹھا ہوں اور جاگتی جگمگاتی روشنیوں کا جلوس نظروں کے سامنے گزرنے لگا ہے۔ اس میں سرو یشس اور سوفٹ ہیں۔ مونتان اور ریبلے ہیں۔ کہیں وڈہاؤس اور جیمس تھربر ہیں۔ اپنے اردگرد کے حلقے میں جعفر زٹلی سے لے کر مشتاق یوسفی تک یہ کارواں بڑھتا چلا جاتا ہے۔ کہیں فرحت اللہ بیگ تو کہیں عظیم بیگ چغتائی اور پطرس بخاری کہیں حاجی لق لق اور سند باد جہازی تو کہیں رشید احمد صدیقی اور شفیق الرحمٰن--- کہ ہنساتے ہیں اور ہنسی ہنسی میں غور و فکر کے وہ وہ رمز بجھاتے ہیں کہ بقول شاعر برسوں پڑھو تو یاد نہ ہووے سبق مرا۔

ہنسی ہنسی میں بات کہہ جانا جتنا مشکل فن ہے اس فن کا مذاق اڑانا اتنا مشکل نہیں۔ اسی لئے طنز و مزاح کو انعام و اکرام سے تعبیر کیا گیا ہے جو قوموں کو بڑی محنت اور ریاضت سے ملتا ہے۔ اپنے اردگرد آپ لوگوں کو معمولی سے معمولی بات پر قہقہہ لگاتے دیکھیں گے اور اسی سے ان کے ظرف اور مزاج کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ کوئی کس بات پر ہنستا ہے اور کیسے ہنستا ہے۔ یہی ان کی تہذیبی سطح کو متعین کرنے کے لئے کافی ہے۔

اخبار کے مزاحیہ کالم کے لئے طنز و مزاح لکھنا اور بھی دشوار ہے۔ روز روز کی ملاقات سے یونہی تازگی جاتی رہتی ہے اور پڑھنے والا پہلے ہی سے کچھ چوکنا کچھ متوحش ہونے لگتا ہے۔ اس میں قدرے کمی کر سکتا ہے تو اخبار کے دوسرے مندرجات کا بھاری پن کہ پڑھنے والا اس کی ضرب شدید سے گھبرا کر عارضی ہی سہی ابر مزاح کے سائے میں کھسک آتا ہے۔

نصرت ظہیر نے جب لکھنا شروع کیا یا یوں کہئے کہ جب میں نے انہیں پڑھنا شروع کیا وہ میرے لئے بڑی مایوسی اور دل گرفتگی کا دور تھا۔ اخبارات ناخوشگوار بلکہ دلخراش خبریں اگل رہے تھے۔ اداریئے اداس تھے اور الفاظ سیاہ ماتمی پیکر اوڑھے ہر روز ملنے آتے تھے--- اور پھر اردو کے اخبار کہ ان میں نہ نامہ نگار کی شخصیت کا وفور تھا نہ اسلوب کا خروش۔ مدتوں سے جو اخبار پڑھتا آیا تھا اس میں رفتہ رفتہ نصرت ظہیر

جیبیں تھیں اپنی خالی، کیوں دیتا ورنہ گالی
وہ سنتری ہمارا وہ پاسباں ہمارا

پولس کی فطرت کو نہ کوئی سمجھ پایا ہے، نہ سمجھنے کا حوصلہ رکھتا ہے۔ البتہ علامہ اقبال بڑے حوصلہ والے آدمی تھے (مونچھیں بھی رکھتے تھے)۔ چنانچہ ایک جگہ فرماتے ہیں۔

یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

ایک اور جگہ، اس خاکی وردی والی مخلوق کی ہیبت کا ذکر انہوں نے بڑے دلکش انداز میں کیا ہے۔ فرماتے ہیں۔

عروج آدم خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں

پے کمیشن : تنخواہ کمیشن۔ جب کوئی حکومت یہ دیکھتی ہے کہ ملازمین کی تنخواہ اور مہنگائی میں کوئی اضافہ نہیں ہو رہا ہے، اور بیشتر لوگ سکون کی زندگی گزار رہے ہیں، تو وہ اس جمود کو توڑنے کے لیے ایک پے کمیشن بنا دیتی ہے۔ یہ کمیشن ملازمین کی تنخواہ بڑھا دیتا ہے، جس سے مہنگائی بڑھ جاتی ہے۔ مہنگائی بڑھنے سے تنخواہ میں کیا گیا اضافہ بے معنی ہو جاتا ہے اور ملازمین ایک اور پے کمیشن بنانے کا مطالبہ کرنے لگتے ہیں، جس سے پھر تنخواہ بڑھتی ہے پھر مہنگائی ہوتی ہے، پھر پے کمیشن بنتا ہے اور یہ سلسلہ چلتا رہتا ہے۔ بعض حرف شناس لوگ پے کمیشن کی "پے" کو اردو کی پے سمجھ کر یہ سوچنے اور سوچ سوچ کر پریشان ہونے لگے ہیں کہ حکومت تے کمشن، ٹے کمیشن، جیم کمیشن اور چے کمیشن کیوں نہیں بناتی۔ اپنی اپنی سوچ کی بات ہے۔ ہم اس سلسلے میں کچھ نہیں کہیں گے۔

پولنگ بوتھ : دیکھو الیکشن۔

ٹیلی فون : گھنٹی بجانے کا ایک آلہ جسے لوگ دور دراز فاصلے پر بیٹھے ہوئے لوگوں کو "سوری۔ رانگ نمبر" کہنے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ اس آلہ کا بل عموماً بہت لمبا آتا ہے، جسے دیکھتے ہی لوگوں کے ہوش اڑ جاتے ہیں اور انہیں ٹیلی فون کی گھنٹی سے بھی وحشت ہونے لگتی ہے۔ چنانچہ محاورہ۔۔ "کسی کی گھنٹی بجنا" اسی سے نکلا ہے۔

ٹائم ٹیبل : معمول، نقشہ اوقات، وہ زائچہ جس میں کسی کام کے ہونے یا نہ ہونے کے اوقات درج کئے جاتے ہیں۔ مثلاً، ریلوے ٹائم ٹیبل، جس میں ٹرینوں کی آمد و رفت کے اوقات درج رہتے ہیں۔ تاہم یہ ادھورا ٹائم ٹیبل ہوتا ہے۔ کیونکہ اس میں یہ درج نہیں ہوتا کہ کونسی ٹرین کس اسٹیشن پر کتنی لیٹ ہوگی۔ ویسے ریلوے والوں کا اصرار ہے کہ ان کی کوئی ٹرین لیٹ نہیں ہوتی اور مجموعی طور پر تمام ٹرینیں ٹائم ٹیبل کے مطابق رکتی اور چلتی ہیں۔ بس اتنی بات ہے کہ بعض ٹرینیں بعض دوسری ٹرینوں کے ٹائم ٹیبل پر آجاتی ہیں، اور دوسری ٹرینیں بعض تیسری ٹرینوں کے اوقات پر پہنچ جاتی ہیں۔ ڈاکٹر حضرات

اپنی دکان (جسے وہ کلینک کہتے ہیں) اور اپنے مکان پر مریضوں سے موسم گرما اور موسم سرما میں ملنے کے اوقات درج کر دیتے ہیں۔ یہ بھی ٹائم ٹیبل ہے۔ البتہ لفظ اوقات کچھ غلط فہمی پیدا کر دیتا ہے۔ جبھی تو پاکستان کے مشہور ظریف عمر شریف ایک ڈرامہ میں کہتے ہیں کہ بڑے سے بڑے ڈاکٹر کی بھی صبح شام میں صرف دو تین گھنٹے کی اوقات ہوتی ہے 'بس! معمول کو بھی ٹائم ٹیبل کہتے ہیں' لیکن اگر کسی شہر میں فساد ہو جائے تو اگلے روز فساد رکنے پر یہ کبھی نہیں کہا جاتا کہ صورت حال ٹائم ٹیبل کے مطابق ہے۔ پتہ نہیں کیوں؟

یہ لفظ ٹائم اور ٹیبل سے مل کر بنا ہے۔ بعض کم عمر کے بچے یہ سمجھتے ہیں کہ اگر کسی میز پر ٹائم پیس رکھا ہو تو یہ بھی ٹائم ٹیبل ہوتا ہے۔ لیکن عمر رسیدہ بچے ایسا نہیں سمجھتے۔ ہم جانتے ہیں کہ جھگی بستیوں میں رہنے والوں کے گھروں میں نہ میز ہوتی ہے نہ ٹائم پیس۔ پھر بھی ان کا ایک معمول ہوتا ہے۔ صبح اٹھ کر گندگی میں رفع حاجت کو جاتے ہیں۔ پھر بغیر ناشتہ کئے بیڑی کا دھواں اڑاتے ہوئے کام پر نکلتے ہیں۔ دوپہر کو روکھی سوکھی کھانے کے بعد شام کو کام سے نمٹ کر گھر آتے ہیں اور رات کو پھر روکھی سوکھی 'یا تبدیلی ذائقہ کے لیے سوکھی روکھی کھا کر مزے سے سو جاتے ہیں۔ اگلے روز پھر یہی ہوتا ہے اور زندگی بھر ہوتا رہتا ہے۔ اسے ہم جھگی والوں کا ٹائم ٹیبل کہہ سکتے ہیں۔

جج : اردو میں یہ لفظ صرف ایک حرف کی تکرار سے لکھا جاتا ہے۔ لیکن انگریزی میں پورے پانچ حرف لکھنے پڑتے ہیں۔ لہٰذا انگریزی میں لوگوں کی کس طرح تضیع اوقات ہوتی ہے' یہ لفظ اس کا ثبوت ہے۔ پوش کالونیوں کے سفید پوش ہندستانیوں کی کسی محفل میں اگر کوئی غلط سلط انگریزی کی بجائے صاف ستھری ہندستانی بولنے لگے تو اس سے بھی آدمی کی اوقات گھٹ جاتی ہے۔ یہ انگریزی سے ہونے والی تضیع اوقات کا دوسرا ثبوت ہے۔

بہرکیف۔ جج کا مطلب ہے منصف' یعنی انصاف کرنے والا۔ انصاف ایک ایسا پراسیس اور ایک ایسی پر اسرار چیز ہے جس کے حصول تو کیا عدم حصول میں بھی آدمی کا اچھا خاصا وقت ضائع ہو جاتا ہے۔ یہ بھی تضیع اوقات ہی ہے (قابل غور ہے کہ عموماً" مقدمہ اتنی دیر میں فیصل ہوتا ہے کہ کیا ہارنے والے کیا جیتنے والے دونوں کی اوقات ایک دھیلے کی نہیں رہتی)۔ پس' ثابت ہوا کہ جج بہر حال تضیع اوقات کا سبب بنتا ہے۔ انگریزی میں بھی ہندستانی میں بھی۔ ایک جج کو واحد جج کہتے ہیں مگر کئی ججوں کو ججان کہا جاتا ہے۔ یہ ایسا ہے جیسے کوئی ہکلا شخص اپنی محبوب سے مخاطب ہو۔ یہاں قارئین کی دلجوئی کے لیے حضرت دلاور فگار کی مشہور نظم ہکلے کا پیار سے ایک اقتباس نقل کیا جاتا ہے:

ججا جان من' تری ذات سے' مما مجھ کو ہی پپا پیار ہے
غغا غیر ہے' خخا خود غرض' ووا وقت کا -یا یار ہے

تخا خرچ کا غغاغم نہیں ' پپا پیسہ بھی ککا کم نہیں'
مرے پاس بھی ٹٹا ٹی وی ہے' ببا بنگلہ ہے' ککا کار ہے
تخا خط میں تو نے یہ کیا لکھا' ووا وصل غیر سے ہوگیا'
تخا خط ترا تخا خط نہیں' مری موت کا تتا تار ہے

معاف کیجئے۔ ہم بھی کہاں سے کہاں آپہنچے۔ پتہ نہیں کبھی کبھی ہمیں یعنی مرتب لغات ہذا کو کیا ہوجاتا ہے۔ خدا خیر کرے!

جنگل : ابھی تک یہ طے نہیں ہوسکا ہے کہ یہ لفظ ہندستانی سے انگریزی میں گیا ہے یا انگریزی سے ہمارے یہاں آیا ہے۔ ویسے ہندستان میں جنگل انگریزوں کے آنے سے پہلے بھی موجود تھے۔ جنگل وہ جگہ ہے جہاں صرف جانور رہتے ہیں۔ انسانوں میں صرف ٹارزن کو وہاں رہنے کا حق ہے۔ ویسے اردو شاعری میں دیوانہ عرف وحشی عرف اہل جنوں جب اہل ہوش و خرد سے تنگ آجاتا ہے تو وہ بھی اسی کا رخ کرتا ہے۔ مگر باوجود ہزار کوشش کے ٹارزن نہیں بن پاتا۔ چنانچہ توبہ استغفار کے بعد واپس بستیوں کا رخ کرتا ہے اور شادی بیاہ کے بعد بہت سے بچے پیدا کرکے یاد خدا میں مصروف ہوجاتا ہے' یہاں تک کہ لوگ اسے حافظ جی کہنے لگتے ہیں۔ جنگل کا انسان سے بڑا گہرا تعلق ہے۔ داناؤں یعنی کئی دانا حضرات کا کہنا ہے کہ انسان کو انسان بنانے میں جنگل کا بڑا ہاتھ ہے۔ لیکن انسان جنگل سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔ اسے جہاں جنگل نظر آتا ہے کاٹ دیتا ہے اور زمین کو صاف کرکے اس پر سیمنٹ' لوہا اور کنکریٹ بچھادیتا ہے۔ پتہ نہیں انسان جنگل سے اتنی نفرت کیوں کرتا ہے۔ ہر انسانی خرابی جنگل کے نام سے منسوب کردی جاتی ہے۔ کوئی آدمی عجیب حرکتیں کرے تو اسے جنگلی کہہ دیا جاتا ہے۔ کسی علاقہ میں افراتفری مچی ہو' بدعنوان حکام ظلم ڈھارہے ہوں' لوگ بھوکوں مررہے ہوں' طوائف [illegible] کی کے حالات پیدا ہورہے ہوں تو اسے جنگل راج کہہ دیتے ہیں۔ جب کہ جنگل میں ایسا راج کبھی نہیں دیکھا گیا۔ جنگل میں تو طوائفیں تک نہیں ہوتیں' لہٰذا وہاں طوائف الملوکی کا یوں بھی کوئی امکان نہیں!

چین : زنجیر۔ جس سے قیدی جکڑے اور کتے باندھے جاتے ہیں۔ ٹرین روکنے کے کام بھی آتی ہے۔ عورتیں طلائی زنجیر بنواکر گلے میں پہنتی ہیں۔ آئے دن چور اچکے ان زنجیروں کو جھپٹ لیتے ہیں اور عورتوں کو چھوڑدیتے ہیں' پھر بھی پہنتی ہیں۔ پتہ نہیں یہ عورتیں کب باز آئیں گی۔ اردو رسم الخط میں یہ لفظ کئی طرح کی غلط فہمیاں پیدا کردیتا ہے۔ ایک جدید افسانہ کا اقتباس ملاحظہ ہو۔

"....اس نے بے چین ہوکر سونے کی چین اتاری پھر بھی چین نہ آیا۔ تبھی اس کے ہم سفر نے چین پر گفتگو شروع کردی اور چین کو کافی برا بھلا کہا۔ اس کا خیال تھا کہ تبت والے چین کو تب تک چین سے نہ بیٹھنے دیں گے جب تک ہند چین.... مگر اس کا جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی اس کے ہم سفر نے ڈبے

کی چین کھینچ دی۔ کچھ ہی دیر میں گاڑی رک گئی اور مسافر چین بجبیں ہو کر دونوں کی طرف دیکھنے لگے۔ مگر وہ اب بھی چیں چیں کیے جا رہا تھا...''

یہاں لائق افسانہ نگار نے اتنی مرتبہ چین کا استعمال کیا ہے کہ سادہ لوح قارئین سوچ میں پڑ جاتے ہیں کہ کس چین سے کون سا یا کون سی چین مراد ہے۔ یہاں تک کہ افسانے کے عنوان ''چین کی بنسی'' سے بھی پتہ نہیں چلتا کہ مصنف ملک چین کی کسی بانسری کا ذکر کر رہا ہے یا اس چین کی بانسری کا جو بے چینی ختم ہونے پر محاورے میں بجتی ہے۔ اس لفظ میں اگر نون کا نقطہ لگنے سے رہ جائے تو اور بھی پریشانی ہوتی ہے۔

ڈسٹری بیوٹر : دیکھو سپلائر۔

ریکٹ : وہ ناجائز دھندا جسے پوش کالونیوں کے سفید پوش لوگ روپوش رہ کر کرتے ہو۔ ٹینس کے بلے کو بھی ریکٹ کہتے ہیں۔ پتہ نہیں کیوں!

زیبرا : ایک چالاک افریقی گھوڑا جو ہر وقت میک اپ میں رہتا ہے اور اپنے جسم پر دھاریاں بنائے رکھتا ہے کہ کہیں لوگ اسے عام ہندستانی گھوڑا سمجھ کر تانگے میں نہ جوت لیں۔ بس یہی وجہ ہے کہ آج تک کوئی زیبرا تانگہ میں نہیں جوتا گیا ہے۔ ماہرین لسانیات کا کہنا ہے کہ اگر زیبرا نہ ہوتا تو انگریزی کی ہر بیسک ریڈر با تصویر میں زیڈ کا خانہ خالی رکھنا پڑتا۔ چنانچہ یہ زیبرے کی بدولت ہے کہ آدمی اے سے لے کر زیڈ تک انگریزی پڑھ لیتا ہے۔

سپلائر : دیکھو ہول سیل ڈیلر۔

شو : جوتے کو بھی کہتے ہیں اور نمائش کو بھی۔ اور دونوں کو ملا دیں تو ایک تیسرا لفظ بن جاتا ہے۔ اردو میں یہ سب شو ایک ہی طرح لکھے جاتے ہیں جس سے خاصی پریشانی ہوتی ہے۔ ایک مرتبہ مرتب لغات ہذا کو یعنی ہمیں ایک دعوت نامہ ملا کہ فلاں نمائش گاہ میں فلاں روز ایک شو شو ہو رہا ہے جس کا افتتاح فلاں مرکزی وزیر کریں گے۔ لہٰذا آپ سے بہ نفس نفیس اس شو شو میں شرکت کی استدعا ہے۔ چشم براہ منتظم شو شو۔ شورش شعلہ پوری۔ ہم حیرت سے سوچنے لگے یا اللہ کیا اب مرکزی وزیر شو شو کا افتتاح بھی کرنے لگے ہیں۔ یہ تو بڑی بدتہذیبی کی بات ہے کہ ایک بے حد نجی، ذاتی اور فطری قسم کے عمل کا اس طرح کھلے عام مظاہرہ کیا جائے۔ اور پھر اس کا فائدہ کیا ہوگا سوائے اس کے، کہ تھوڑی سی یوریا کھاد تیار ہو جائے گی۔ اور تھوڑی سی کھاد کے لیے یہ کم بخت شعلہ پوری ہماری شرافت کا جامہ اتار دینا چاہتا تھا! ہم نے دعوت نامے میں دیئے ہوئے ٹیلی فون نمبر پر منتظم شو شو سے رابطہ کیا اور اس سے پوچھا کہ اس بے شرمی کے مظاہرہ میں شرکت کے لیے ہم سے استدعا کرنے کی جراءت اس نے کیوں کر کی، تو اس بندۂ نیک بخت نے یہ بتا کر شرمندہ اور خجل کر دیا کہ یہ شو شو دراصل وہ شو شو نہیں تھا جو ہم سمجھ رہے

تھے۔ یہ تو جوتوں کی نمائش کا پروگرام تھا۔ لہٰذا قارئین کو صلاح دی جاتی ہے کہ وہ اس لفظ سے ہوشیار رہیں۔

فیل : یہ بھی بڑا گمراہ کرنے والا لفظ ہے۔ انگریزی میں دو طرح کے فیل ہوتے ہیں' ایک تو ہے پاس والا فیل (یہاں انگریزی والے پاس سے مراد ہے اردو والے پاس سے نہیں)۔ اور دوسرا ہے احساس والا فیل۔ اس احساس والے فیل کو عربی میں اصحاب الفیل والا فیل یعنی ہاتھی کہتے ہیں جو بہت فیل کرنے والا جانور ہے۔ لطف یہ ہے کہ اکثر ہاتھیوں کو اس کی خبر تک نہیں ہوتی کہ وہ اس قدر حساس جانور ہیں۔ دوسرے لفظوں میں بیشتر ہاتھی اتنے بے حس ہوتے ہیں کہ انہیں اپنے حساس ہونے کا بھی احساس نہیں ہوتا۔

کرپشن : دور جدید کا ایک ناگزیر اقتصادی عمل جو کسی بھی جدید قوم کی تیز رفتار اور چو طرفہ ترقی کا ضامن ہے۔ قدیم پس ماندہ اقوام کے پچھڑے پن کی وجہ یہی بتائی جاتی ہے کہ ان کے ہاں کرپشن کم تھا۔ مورخین یعنی کئی مورخ وادئی سندھ کی تہذیب کے فنا ہونے کا سبب بھی یہی بتاتے ہیں کہ یہ تہذیب کرپشن سے نا آشنا تھی۔ ہمارے ملک میں کرپشن نے اس قدر ترقی کرلی ہے کہ اگر اسے ختم کردیا جائے تو سارا نظام ٹھپ ہوجائے گا۔ مگر افسوس اتنی ترقی کے باوجود اسے قانونی تحفظ حاصل نہیں ہوسکا ہے۔ چنانچہ آج کل اسے قانونی شکل دینے کا نظریہ کافی زور پکڑ رہا ہے۔ لوگوں کا خیال ہے کہ اگر کرپشن کے قانونی قاعدے اور ضابطے مقرر کردئے جائیں تو اس سے غیر قانونی کرپشن ہمیشہ کے لئے ختم ہوسکتا ہے۔

کارپوریشن : عام آدمی اس لفظ سے صرف میونسپل کارپوریشن مراد لیتا ہے جو اسمبلی اور پارلیمنٹ جیسا ایک عوامی ادارہ ہوتا ہے۔ جس طرح پارلیمنٹ میں پورے ملک کے حالات پر غور ہوتا ہے اور اسمبلی میں پورے صوبے کی صورت حال دیکھی جاتی ہے اسی طرح میونسپل کارپوریشن میں پورے شہر پر دھیان دیا جاتا ہے۔ ان اداروں کے لیے الیکشن کے ذریعہ (فوراً دیکھو لفظ الیکشن) عوام اپنے عوامی نمائندے چنتے ہیں اور یہ عوامی نمائندے ان اداروں میں جاکر عوام کا اتنا خیال رکھتے ہیں کہ اکثر عوام عاجز آجاتے ہیں۔ ان اداروں کا استعمال عوامی نمائندے عوامی مسائل پر بحث کے لئے کرتے ہیں۔ یہ لوگ ان اداروں میں اس قدر بحث کرتے ہیں کہ اچھا خاصا مباحثہ ہوجاتا ہے۔ کئی بار تو بحث پر بھی یہ بحث چھڑ جاتی ہے کہ یہ بحث کیوں ہورہی ہے اور دوسری بحث کیوں نہیں کرائی جارہی ہے۔ چنانچہ پہلی بحث اور دوسری بحث کا نتیجہ جو تم پیزار اور مار پیٹ کی شکل میں نمودار ہوتا ہے' جو کہ ظاہر ہے عوامی خدمت کے جذبے سے ہوتی ہے۔ اس سب کے بعد ہاؤس کی کاروائی ملتوی ہوجاتی ہے' ممبر معطل کردیے جاتے ہیں' اور جب دوبارہ اجلاس بلایا جاتا ہے تو اس معطلی پر بحث شروع ہوجاتی ہے۔ جس کے بعد یہ بحث ہوتی ہے کہ اس پر بحث کیوں ہورہی ہے۔ دوسرے معاملے پر بحث کیوں نہیں کی جارہی ہے۔

THIS EBOOK IS DOWNLOADED FROM
SHAAHISHAYARI.COM

LARGEST COLLECTION OF URDU
SHERS, GHAZALS, NAZMS AND EBOOKS.

نتیجہ یہ کہ پھر جوتے چلتے ہیں، پھر مکے بازی ہوتی ہے، پھر سر پھوٹتے ہیں، پھر اجلاس ملتوی ہوتا ہے، اور ہاؤس کا صدر، پرانے ممبروں کو بحال کرکے کچھ اور ممبر معطل کردیتا ہے۔ اس کے بعد پھر اجلاس ہوتا ہے، پھر بحث ہوتی ہے--- وعلیٰ ہذا القیاس۔ اس دوران عوام حیران ہوکر دوسرے عوام سے پوچھتے رہتے ہیں، 'کیوں بھئی، یہ لوگ کس بات پر بحث کررہے ہیں۔

میونسپل کارپوریشن وہ ادارہ ہے جو شہر کی صفائی، صحت اور تعلیم کا انتظام کرتا ہے۔ لیکن بعض کارپوریشنیں اس کی بجائے گندگی اور امراض کا انتظام کرنے لگتی ہیں۔ جس سے لوگ پریشان ہوجاتے ہیں۔ اس پر مرتب کے ایک بنگالی دوست نے ایک مرتبہ یہ کہا کہ "کورپوریشن کا مطلب ہے وہ جو پوریشان کورتا ہے!"

گڈمارننگ : صبح بخیر۔ اگر کوئی صبح سوکر اٹھے خاص کر انگریز، تو اسے گڈمارننگ کہتے ہیں۔ اس طرح صبح کی نہیں انگریز کی تعریف کی جاتی ہے۔ ہم ہندستانی اول تو صبح کو سوکر نہیں اٹھتے اور اگر اٹھتے ہیں تو جاگنے میں دیر لگاتے ہیں۔ لہٰذا ہمیں کوئی گڈمارننگ نہیں کہتا۔ البتہ اٹھنے والا جماہی لے کر کبھی کبھی خود ہی کہہ دیتا ہے صبح بخیر گزری۔ گڈمارننگ کی طرح 'گڈڈے' 'گڈنون' 'گڈآفٹرنون' 'گڈایوننگ' 'گڈنائٹ' وغیرہ بھی ہوتے ہیں، لیکن اس سے یہ نہ سمجھ لینا چاہیے کہ انگریز دوپہر کو، سہ پہر کو، شام کو یا رات کو بھی سوکر اٹھتے ہیں۔ یہ سب الفاظ جاگے ہوئے انگریز سے کہے جاتے ہیں جو بڑا خطرناک ہوتا ہے۔ اس لئے کسی بھی جاگے ہوئے انگریز کو اچھی طرح سوچ سمجھ کر اور گھڑی یا سورج کی تازہ ترین پوزیشن دیکھ کر گڈ کہنا چاہیے۔ اگر اسے ۱۲ بج کر ایک منٹ پر بھی گڈ آفٹرنون کی بجائے گڈنون کہہ دیا تو وہ ناراض ہوجائے گا۔ کوئی شخص غلط وقت پر گڈمارننگ یا گڈایوننگ کہہ دے تو انگریز برا مان جاتا ہے۔ دراصل انگریز وقت کا بڑا پابند ہوتا ہے۔ مگر افسوس وقت اس کا پابند نہیں ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ انگریز کی پتنگ پوری دنیا میں اڑتی تھی وقت کے ساتھ پتنگ اور ڈور تو دونوں، ہاتھ سے نکل چکی ہیں۔ اب خالی چرخی باقی رہ گئی ہے۔ سچ کہا ہے کسی نے اللہ بس، باقی ہوس اور سکندر جب گیا دنیا سے دونوں ہاتھ خالی تھے!

لیڈر : انگریزی میں قائد- راہ بر، راہ نما اور راستہ دکھانے والے کو لیڈر کہتے ہیں۔ مگر ہمارے یہاں قیادت نہ کرنے والے، راستہ دکھاکر لوٹنے والے اور راہ سے بھٹکانے والے کو بھی بہ نظر احترام، لیڈر کہہ دیا جاتا ہے۔ ہمارے یہاں لیڈر کو عوام کی بہت فکر رہتی ہے۔ اکثر وہ ان کے مسائل سے رنجیدہ ہوکر حکام کے ساتھ ہر رات بوقت ڈنر تبادلہ خیالات کرتا ہے اور ہر رات مسائل کے حل میں ناکام رہنے پر اسے مجبوراً "گھر واپس جاکر آرام کرنا پڑتا ہے۔

ماسٹر : پہلے یہ دیکھنا ہوگا کہ آپ کس ماسٹر کا مطلب جاننا چاہتے ہیں۔ ماہر فن، استاد فن یا محض استاد کو ماسٹر کہتے ہیں اور ہمارا سماج ہر طرح کے ماہرین سے بھرا پڑا ہے۔ ویسے پرائمری اسکول کے ٹیچر کو

بھی ماسٹر کہا جاتا ہے جو بے چارہ کسی چیز میں ماسٹر نہیں ہوتا۔ اس کے علاوہ جو شخص ان ماسٹروں سے گھر کی سبزی تک منگانے کی طاقت رکھتا ہو وہ ہیڈ ماسٹر' جس نے ایم اے کرلیا ہو وہ ماسٹر آف آرٹس' اور جو دوسروں کے دماغوں کو استعمال کرتا ہو وہ ماسٹر مائنڈ کہلاتا ہے۔ آپ کس ماسٹر کی بات کررہے ہیں۔

ناک آؤٹ : یہ عام طور سے باکسنگ کے کھیل میں ہوتا ہے۔ اگر ایک باکسر دوسرے باکسر کی ناک پر ایک خطرناک مکا جماکر اسے ناک آؤٹ کردے تو اسے ناک آؤٹ کہتے ہیں۔ کیا کہا' مطلب سمجھ میں نہیں آیا۔ کوئی بات نہیں۔ سمجھنے کی کوشش بھی نہ کیجئے۔ کیا آپ کو اپنی ناک پیاری نہیں؟

واک آؤٹ : پارلیمنٹ اور اسمبلی وغیرہ میں چونکہ باکسنگ ممنوع ہے' اس لیے وہاں اپوزیشن والے سرکار کا ناک میں دم کرنے کے لیے (اور بعض حالتوں میں لابی میں جاکر ٹی وی پر کرکٹ میچ دیکھنے کے لیے) ہاؤس سے چلے جاتے ہیں جسے واک آؤٹ کہہ دیا جاتا ہے۔ ہاؤس سے احتجاجاً" باہر چلے جانے کو' ہاؤس سے چلا جانا کہیں تو ایسا لگتا ہے جیسے کچھ بھی نہیں ہوا۔ لہٰذا اسے واک آؤٹ کہتے ہیں۔ جس سے پٹاخے جیسی آواز آتی ہے۔ کئی ممبروں کو واک آؤٹ کا اتنا شوق ہوتا ہے کہ ہاؤس میں جاتے ہی اس لئے ہیں تاکہ واک آؤٹ کرسکیں اور اس کی خبر اخباروں میں چھپ جائے۔

ہول سیل ڈیلر : نہیں بتاتے۔ کرلو جو کرنا ہے!

☆ ☆ ☆

لنگڑی ترازو

اسے زمانے کی تیز رفتاری کہئے یا کچھ اور کہ مرحوم سوویت یونین سے کمیونزم کو رخصت ہوئے ابھی مشکل سے تین چار سال ہی ہوئے ہیں مگر ایسا لگتا ہے جیسے اس سانحے کو صدیاں بیت گئی ہیں اور یہ واقعہ تب کا ہے جب کولمبس ہندستان کے دھوکے میں امریکہ دریافت کر بیٹھا تھا۔ اس کے برعکس اجودھیا کا تنازعہ شروع ہوئے چالیس برس سے زیادہ گزرے مگر محسوس یہ ہوتا ہے یہ کل ہی کی بات ہے۔ بلکہ کبھی کبھی تو اس کا بھی یقین نہیں آتا کہ اڈوانی جی کی رتھ یاترا ابھی کی ختم ہو چکی ہے۔ بس یوں لگتا ہے جیسے ان کا رتھ کل ہی بہار میں داخل ہونے والا ہے۔

زمان و مکان' الگ الگ واقعات کے ساتھ الگ الگ طرح کا سلوک کیوں کرتے ہیں۔ یہ بات ہماری تو کیا ابھی میاں عبدالقدوس کی سمجھ میں بھی نہیں آئی ہے۔ اس لیے ہم اس بات کی بات نہیں کریں گے۔ یہی نہیں ہم اس بات پر بھی بات نہیں کرنا چاہتے کہ آخر کیا بات ہے جو کمیونزم دنیا سے دور چلا جانا چاہتا ہے۔ معاف کیجئے بات کی بات پر اس وقت ہمیں اپنا ہی ایک پرانا شعر یاد آگیا ہے جو ہم نے اسکول کے دنوں میں ایک صاحب کو تنگ کرنے کے لیے کہا تھا۔ لفظ بات ان کا تکیہ کلام تھا جس کا وہ بات بات پر استعمال کرتے تھے۔ ان کے اکثر جملے اس طرح ہوتے تھے۔۔

"مجھے آپ سے ایک ضروری بات پر بات کرنی ہے۔ کل شام سے سوچ رہا تھا کہ آپ سے اس بات پر بات کرنے کی بات کروں' لیکن آپ تو کبھی ہم سے بات کرنے کی بات ہی نہیں کرتے آخر ایسی کیا بات ہے جو آپ بات کرنے کی بات کرنے سے اس قدر گریز کی بات کر رہے کہ بات بات پر بات بات...."

انہیں چھیڑنے کے لیے ہم نے جو شعر کہا وہ اس طرح تھا۔

بات ہی بات میں جو بات نکل آئی ہے'
بات تو تب ہے کہ اس بات سے کچھ بات بنے

مگر آپ جانتے ہیں جب ہم نے انہیں یہ شعر سنایا تو کیا ہوا۔ شعر سنتے ہی ان کا چہرہ سرخ ہو گیا' آنکھیں باہر کو نکل آئیں اور اچانک دہاڑ کر بولے۔

"واہ واہ کیا بات ہے۔ بات سے کیا بات نکالی ہے۔ سبحان اللہ۔ ایک شعر میں چھ مرتبہ بات کی تکرار۔ آہ کیا بات ہے۔ واہ کیا بات ہے۔ اوہ کیا بات ہے...."

بہرکیف' بات ہم اس بے کیفی کی کرنا چاہتے ہیں جو آج کل ترقی پسند دانشوروں کی محفلوں میں پائی جانے لگی ہے اور جن میں ہم کبھی بڑے ذوق و شوق سے جایا کرتے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ کمیونزم کا زوال ان محفلوں کی بے رونقی کا بنیادی سبب ہے۔ ورنہ ایک دور وہ بھی تھا جب ایسی ایسی وزنی اور ادق سیاسی اصطلاحات ان محفلوں میں مباحثوں کے دوران سننے کو ملتی تھیں کہ کان جھنجھنانے لگتے تھے' دماغ میں سنسناہٹ شروع ہو جاتی تھی' روح میں ارتعاش پیدا ہو جاتا تھا اور آنکھوں میں روشن مستقبل کی امیدوں کے جگنو چمکنے لگتے تھے۔

سستی چاء کے سستے ہوٹلوں میں سجنے والی یہ وہ محفلیں ہوتی تھیں جن میں ہر نووارد سے پہلا سوال یہ کیا جاتا تھا کہ آپ دائیں بازو کے ہیں یا بائیں بازو کے؟

ہم سے جب یہ سوال پہلی بار ہوا تو چکرا گئے۔ مگر پھر اس خیال سے خود کو سنبھال لیا کہ پڑھے لکھے دانشوروں کی محفل میں بیٹھے ہیں۔ کچھ سوچ کر ہم نے دانشوران محفل کو بتایا۔

"جناب والا ویسے تو ہم دائیں بازو کے ہیں کہ لکھتے بھی دائیں ہاتھ سے ہیں اور کھانا بھی اسی ہاتھ سے کھاتے ہیں' یہاں تک کہ مصافحہ کرتے وقت ہاتھ بھی دائیں ہاتھ سے ہی ملاتے ہیں' لہٰذا ہمیں پورا شبہ ہے کہ ہو نہ ہو ہم دائیں بازو والے ہیں۔ لیکن آپ اطمینان رکھیں۔ ضرورت پڑنے پر کئی کام ہم بائیں بازو سے بھی کر لیتے ہیں۔ لہٰذا آپ ہمیں دونوں بازوؤں کا آدمی سمجھئے۔"

ہمارے بیان سے کئی دانشوروں کو جھرجھری سی آگئی۔ ان میں سے ایک نے جو اپنی الجھی داڑھی' بکھرے بال' ٹوٹی عینک' میل بھرے لمبے ناخنوں' گندے کرتے پاجامے' منہ میں دبی چارمینار کی سگریٹ اور سگریٹ کے دائیں بائیں جھانکنے والے پیلے دانتوں کی وجہ سے بہت زیادہ دانشور معلوم ہوتا تھا' اس زور سے میز پر مکہ مارا کہ چاء کے کئی گلاس الٹ گئے اور ہم بنچ سے گرتے گرتے بچے۔ اس نے گرج کر کہا---

"ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ آدمی یا تو دائیں بازو کا ہو گا یا بائیں بازو کا۔ ایک آدمی دو بازو نہیں رکھ

کے انداز گفتگو نے متوجہ کیا کہ اس کبھی نہ ختم ہونے والے ریگستان میں نخلستان کا قرینہ بھی کہیں نہ کہیں نظر آنے لگا تھا۔

جو بات مجھے اچھی لگی وہ یہ تھی کہ ان تحریروں میں کوئی شور شرابا' کوئی دعویٰ' کوئی بڑبولا پن نہیں تھا' یہ تو تازہ ہوا کے ایک ہلکے جھونکے کی طرح تھے۔ نہ کوئی طمطراق' نہ کوئی طوفانی پیچ و تاب۔ یہ ادا اس وقت مجھے اور بھی اچھی لگی جب دل کئی پہلو سے دکھا ہوا تھا۔ ایک ملک کے سیاسی رخ سے کہ جس ظلمت پسندی کے خلاف صف آرائی میں زندگی گزاری تھی وہی اب بقول شاعر سب کی زباں ٹھہری تھی۔ دوسرے پاکستان میں طنز و مزاح کے جاگتے جگمگاتے نصف النہاری سورج ایک ایک کر کے گہنا گئے تھے۔ شفیق الرحمٰن' ابن انشا' کرنل محمد خاں' مشتاق یوسفی۔ ہاں لکھ رہے تھے تو مشفق خواجہ "خامہ بگوش" کے نام سے لکھ رہے تھے۔ مگر اس میں مزاح کم اور چبھن زیادہ تھی۔ اپنے ملک میں مجتبیٰ حسین نے تقریباً بساط تہہ کر دی تھی۔ یوسف ناظم اور کبھی کبھار دلیپ سنگھ کے سہارے کام چل جاتا تھا۔۔۔ گویا چراغ گل پگڑی غائب کا مضمون تھا۔ یہ اس کارواں کا پایان سفر تھا جو جعفر زٹلی سے لے کر رتن ناتھ سرشار تک اور وہاں سے کنہیا لعل کپور تک پہنچا تھا۔ یہ نصرت ظہیر کہاں سے نکل آئے؟ مجھے ان کے بارے میں قطعی علم نہ تھا اور اب بھی بہت ناقص سی معلومات فراہم ہوئی ہیں جو انہوں نے اس مجموعے میں دیباچے کے طور پر ارزانی کی ہیں۔ مگر سچی بات یہ ہے کہ کم سے کم میرے لئے نصرت ظہیر کے مضامین قومی آواز کے جمازی صفحوں میں ڈوبتے کو تنکے کا بہانہ تھے کہ میں انہیں کے ذریعے چبھتی ہوئی معاندانہ خبروں کے اس بحر اقیانوس کو پار کر لیتا تھا۔ اور یہی طنز و مزاح دونوں کی میرے نزدیک سب سے کھری پہچان ہے کہ کچھ دیر کے لئے آپ کو زیادہ گہرائی اور گیرائی سے حقیقتوں کا ادراک کرانے کے لئے وہ حقیقت کی تلخ موجودگی کو گوارا بنا دے۔

چنانچہ نصرت ظہیر طلوع ہوئے۔ سب سے زیادہ حیرت مجھے اس پر ہوئی کہ بغیر کسی پوز' یا بنوٹ کے طلوع ہوئے۔ نہ تو انہوں نے رسمی اور روایتی لطیفوں کا سہارا لیا نہ ادبیت کا۔ بڑی ہی واقعاتی یا نیم واقعاتی نیم تاثراتی قسم کی نثر کے میدان میں قدم رکھا اور پھر بھی دلچسپی اور دل بستگی قائم کی۔ اور آنسوؤں کو قہقہوں میں نہ سہی کم سے کم مسکراہٹوں میں سموتے چلے گئے (یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اس کے لئے بڑا دل گردہ چاہئے) اور اس بے تکلفی کے ساتھ کہ پڑھنے والے یہ طے نہ کر پائیں کہ کہاں نثر ختم ہوتی ہے اور کہاں مسکراہٹ شروع ہوتی ہے۔

یہ لطیف تاثر پارے کبھی کبھی جی کو چھو لیتے ہیں کہ ان میں اپنائیت کی بو باس ہے اور ہمارے اپنے روز و شب یہاں بھید بدل کر ہم سے ملنے کو آجاتے ہیں۔ اور اس انداز سے کہ ان کی سختی اور تندی کے ڈنک جھڑ چکے ہوتے ہیں اور صرف ان کی چھیڑ چھاڑ کی لذتیں باقی رہتی ہیں۔ البتہ مجھے نصرت ظہیر سے ایک شکایت ہے اور وہ یہ کہ انہوں نے روایتی میساکھیاں کیوں چن لیں۔ نہ مرزا ان کے نہ عبدالقدوس بیگ ان

سکتا۔"

یہ بات اس نے اتنے زور سے آنکھیں نکال کر کہی کہ ہم نے اپنے اوپر فاتحہ پڑھ لی اور جان لیا کہ ایسی دانشورانہ محفلوں میں بیٹھنا ہے تو ہمیں ایک ہاتھ سے ضرور ہاتھ دھونا پڑے گا۔ کیونکہ جس ترازو میں یہ لوگ حقیقتوں کو تول رہے تھے وہ ایک پلڑے کی تھی۔ لہٰذا عدل و اعتدال کی امید فضول تھی۔

ہم نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ "چلئے آپ ہمیں بائیں بازو کا سمجھ لیجئے۔ اب بتایئے ہمیں کیا کرنا ہے۔"

دانشور نے کہا۔ "ٹھیک ہے لیکن کچھ کرنے سے پہلے تمہیں یہ فیصلہ کرنا ہوگا کہ تم بائیں بازو میں کس طرف ہو؟ بائیں طرف یا دائیں طرف۔"

سوال ہماری سمجھ میں نہیں آیا۔ پھر بھی ہم نے کہہ دیا "بائیں طرف۔"

یہ سنتے ہی دانشور کی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں۔ "ویری گڈ! اچھا اب ذرا دماغ پر اچھی طرح زور ڈال کر یہ دیکھو کہ تم بائیں بازو کے بائیں ہاتھ پر کس طرف کھڑے ہو؟ دائیں یا بائیں؟"

وہ کیا چاہتے تھے یہ اب ہماری سمجھ میں آچکا تھا۔ لہٰذا ہم نے کہا۔ "جناب آپ اطمینان رکھئے۔ میں ہر مقام پر بائیں طرف کھڑا ہوں۔ مجھے بائیں کے سوا کچھ سجھائی نہیں دیتا۔ بلکہ دائیں طرف بھی دیکھتا ہوں تو اس میں بھی بایاں دکھائی دیتا ہے۔ لگتا ہے مجھے کچھ ہو گیا ہے...."

"ویری گڈ۔ ویری گڈ۔" دانشور خوشی سے چلایا۔ "اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم بورژوائیت کی بجائے پرولتاریت میں یقین رکھتے ہو۔"

"یہ کیا ہوتا ہے؟" ہم نے ڈری ہوئی آواز میں پوچھا۔

"یہ تمہیں کل بتائیں گے۔ کل تمہاری کلاس لی جائے گی۔ لو یہ سگریٹ پیو۔" یہ کہتے ہوئے انہوں نے چار مینار کے مڑے تڑے پیکٹ سے ایک تڑی مڑی سگریٹ نکال کر ہماری طرف بڑھادی۔

ہم نے سگریٹ سلگائی تو بائیں طرف رکھے نیبل فین کی ہوا سے اس کا دھواں دائیں طرف جانے لگا۔ ہم گھبرا کر ہاتھ سے دھوئیں کا رخ بدلنے لگے۔ اور جب اس کوشش میں کامیاب نہ ہو سکے تو بالآخر اپنی بیٹھ ہی بدل دی تاکہ بجلی کا پنکھا ہمارے دائیں طرف آجائے اور سگریٹ کا دھواں بائیں طرف بہنے لگے۔

اگلے روز اسی تنگ و تاریک چائے خانہ کے چھوٹے سے اندرونی کمرے میں ہماری کلاس لی گئی۔ جس طرح صوفی حضرات مجلس فاتحہ شروع ہونے سے پہلے اگربتیاں جلاتے ہیں، اسی طرح کلاس شروع ہونے سے پہلے کئی دانشوروں نے چار مینار اور پاسنگ شو کی سگریٹیں جیبوں سے نکال کر سلگائیں اور کمرے کو دھوئیں سے بھر دیا۔ جب کمرہ اچھی طرح دھوئیں سے بھر گیا اور دو تین دانشور باقاعدہ کھانسنے

لگے تو سب سے بڑے دانشور نے سب سے زیادہ زور سے کھانس کر اپنا گلا صاف کیا اور یوں گویا ہوا گویا وعظ دے رہا ہو۔

"سب سے پہلے یہ سمجھنا ضروری ہے کہ دنیا میں دو طرح کے سماج اور نظریے ہیں۔ ایک بورژوا دوسرا پرولتاری۔ بورژوا اسے کہتے ہیں جو پرولتاری نہ ہو اور پرولتاری وہ جو بورژوا نہ ہو۔ مثلاً کارخانہ کا مالک بورژوا ہوتا ہے اور اس میں کام کرنے والا پرولتاری۔"

"اور کارخانہ؟" ہم نے اپنی دانست میں ایک اہم سوال پوچھا۔

"وہ کچھ نہیں ہوتا۔ بیچ میں مت ٹوکو۔" دانشور نے جھنجلا کر کہا۔

"ہاں تو بورژوا اور پرولتاری ایک دوسرے کے مخالف ہوتے ہیں۔ کئی لوگ جلد بازی میں بورژوا کو بوژروا کہہ دیتے ہیں۔ یہ غلط بات ہے۔ بہرحال بورژوا اور پرولتاری میں کبھی نہیں بنتی۔ چونکہ کارخانہ کا مالک مزدور نہیں ہو سکتا اور مزدور مالک نہیں بن سکتا اس لیے دونوں میں ٹکراؤ ہوتا ہے۔ ہیگل نے اس ٹکراؤ کے بارے میں کہا تھا۔۔۔ خیر چھوڑو!"

"نہیں نہیں ضرور بتایئے۔ ہمیں اقوال زریں سننے کا بہت شوق ہے۔ کیا کہا تھا ہیگل نے؟ آپ کو ہماری قسم ضرور بتایئے۔ اب بتا بھی دیجئے نا!" ہم نے اصرار کیا۔

"دراصل ہیگل نے جو کچھ کہا تھا اس میں نشے کے خیالات کی کافی جھلک ملتی ہے۔ نشے کا کہنا تھا۔۔۔ خیر چھوڑو؟"

"اوہ! اس نے بھی یہی کہا؟ خیر چھوڑو؟"

"نہیں، یہ میں کہہ رہا ہوں۔" دانشور جھنجلا کر بولا۔

"اف! آپ یہ کیوں کہہ رہے ہیں۔ نشے کو کیوں چھوڑ رہے ہیں۔ اس نے ضرور کوئی اچھی بات کہی ہوگی۔ خدا کے لیے ضرور بتایئے۔"

دانشور نے چند لمحے توقف کیا پھر کہا۔۔ "اصل میں نشے کو خود بھی اس کا لاشعوری ادراک نہیں تھا کہ جو کچھ وہ کہہ رہا ہے اس کی کیا اہمیت ہے، اور اس کا نظریہ دانتے کے تصورات سے کس قدر نزدیک پہنچ گیا ہے جس نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ۔۔۔ خیر چھوڑو!"

"نہیں نہیں۔ اسے بالکل نہ چھوڑیئے۔ للہ دانتے کی بات تو بتا ہی دیجئے۔ پلیز بتایئے تو سہی کیا کہا تھا دانتے نے؟ آہ! شائد آپ نہیں جانتے دانتے ہمیں بہت پسند ہے۔ مگر اسے دانتے کیوں کہتے تھے؟ کیا اس کے بتیس سے زیادہ دانت تھے، یا سب دانت بڑے بڑے تھے؟" ہم نے پوچھا۔

"ہشت! بزرگوں کا نام عزت سے لیتے ہیں۔" دانشور نے ڈانٹا۔ "جانتے ہو، دانتے اتنا عظیم فلسفی تھا کہ اس کے بزرگ بھی اس سے خوف کھاتے تھے اور اس کے سامنے اس کا نام ہمیشہ عزت سے

لیتے تھے۔ بریخت نے ایک مرتبہ اس کی تعریف کرتے ہوئے کہا تھا۔ خیر چھوڑو۔ جانے دو۔"

"اف! اللہ!!" ہم سچ مچ بے چین ہو گئے۔ "کیسے چھوڑ دیں۔ کیسے جانے دیں۔ بریخت تو ہمیں سب سے زیادہ مرغوب ہے۔ اس کی بات آپ کو ضرور سنانی ہوگی۔ بھئی دیکھیے۔ خدا کے لیے آپ کو خدا کا واسطہ ہے۔ سن رہے ہیں آپ؟ اللہ۔ واللہ۔ للہ۔ آپ کو خدا کا واسطہ!"

"میں خدا کو نہیں مانتا۔" دانشور نے پھر ڈانٹ دیا اور ہمیں شک کی نظر سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "کیا تم خدا کو مانتے ہو؟"

ہم نے کہا۔ "ہمارے ماننے نہ ماننے سے کیا فرق پڑتا ہے۔ خدا اگر ہے تو ہے۔ نہیں ہے تو نہیں ہے۔ ہم تو بس اتنا جانتے ہیں کہ ابھی خدا کو ٹھیک طرح نہیں جانتے۔ جب جان جائیں گے تو ماننے نہ ماننے کا سوال پیدا ہوگا۔ اس لیے...."

"صاف صاف بتاؤ۔ مانتے ہو یا نہیں؟"

"ہاں مانتے ہیں۔" ہم نے ڈر کر کہہ دیا۔

"کیوں؟"

"اس لیے کہ بیشتر لوگ مانتے ہیں۔"

"پھر تم کمیونزم کو نہیں سمجھ سکتے۔ کلاس برخاست!" دانشور نے آدھی سگریٹ بجھا کر جیب میں رکھ لی۔

"کیوں؟ کیا کمیونزم کو سمجھنے کے لیے خدا کو نہ ماننا ضروری ہے؟"

"ہاں ضروری ہے۔"

"مگر کیوں؟"

"اس لیے کہ خدا کو ماننے والا جدلیاتی مادیت اور مادی جدلیات کو نہیں سمجھ سکتا اور جدلیاتی مادیت اور مادی جدلیات کی ماورائی جبلت کا تاریخی عرفان تبھی ہو سکتا ہے جب ترقی پسندانہ نظریات کے تناظر میں رجعت پسندانہ ردعمل کے سائنسی و غیر سائنسی محرکات کو منطقی استدلال کی کسوٹی پر کس لیا جائے اور جو نتیجہ برآمد ہو اسے وجودیت اور لاوجودیت کے تجریدی اور مابعد الطبیعاتی اصولوں کے سامنے رکھ کر یہ جائزہ لیا جائے کہ ساختیت پسندوں نے فسطائی رجحانات کو سوفسطائی شکل میں منظرِ عام پر لا کر اپنے تئیں جو تاریخی و جغرافیائی غلطی کی ہے، وہ ظلمت پرستی کے نئے مظاہر میں منعکس ہو کر غیر معکوس اور لامحسوس طریقوں سے...."

یہ سب سنتے سنتے اچانک ہمیں اس زور کی چھینک آئی کہ کئی پتلے دبلے دانشور اچھل کر دور جا پڑے۔

آج جب یہ واقعہ یاد آتا ہے تو کچھ کچھ سمجھ میں آنے لگتا ہے کہ کمیونزم کے زوال کا سبب خود کمیونزم نہیں کچھ اور ہے!

☆ ☆ ☆

بڑے بھائی جان

گھر کے لئے سودا سلف لانا عام طور پر گھر کے نوکروں کا کام سمجھا جاتا ہے۔ لیکن اوسط زندگی گذارنے والے متوسط طبقہ کے درمیانہ لوگوں کو جن کی ساری زندگی دفتروں میں نوکری کرتے کرتے گذر جاتی ہے گھر کا نوکر بھی خود ہی بننا پڑتا ہے۔

تاہم ہمارے ساتھ مشیت ایزدی کو یہ منظور تھا۔ ہم خدا کے ان معدوددے چند نیک اور خوش قسمت بندوں میں سے ایک ہیں جو دفتر میں بھلے ہی نوکری کرتے رہتے ہوں لیکن گھر میں پورے افسر بن کر رہتے ہیں اور ٹھاٹ سے سب پر حکم چلاتے ہیں۔ یہ افسری حاصل کرنے کے لئے ہمیں صرف اتنا کرنا تھا کہ اپنے بھائی بہنوں سے پہلے پیدا ہو جائیں۔ چنانچہ ہو گئے۔ اس کے بعد اور تو سب کچھ ہوا لیکن اللہ کے فضل سے فارسی میں آہ بھر کر یہ کبھی نہیں کہنا پڑا کہ سگ باش، برادر خورد مباش۔

ہمارے چھوٹے بھائیوں نے فارسی پڑھنے کی بہتیری کوشش کی لیکن سب پر اللہ کا کرم رہا اور کسی کو بھی اتنی توفیق نہ ہو سکی کہ گھر کے کاموں سے کچھ وقت فارسی پڑھنے کے لئے نکال سکتا۔ ہر وقت بس یہی رہتا کہ چکی والے سے پوچھ کر آنا ہے، اس نے آٹے کی بوری کیوں نہیں بھیجی۔ ڈیری والے سے کہنا ہے کہ آج کل اس کے دودھ میں ملائی کم آتی ہے۔ مسجد والے امام صاحب کو جا کر بتانا ہے کہ آج شام ان کی دعوت ہے۔ بھائی ناظم علی خاں کو خبر کرنی ہے کہ جمعرات کو محفل میلاد ہو گی لہٰذا اپنی میلاد پارٹی کو تیار رکھیں۔ اس کے علاوہ کبھی کسی کو نئے کورس کی کتابیں دلانی ہیں۔ کبھی مہینے کا راشن لانا ہے۔ کبھی سبزی لانی ہے کبھی گوشت آنا ہے۔

کبھی کوئی تنگ آ کر کہہ دیتا۔ "بھائی جان سے بھی تو کبھی کسی کام کو کہا کیجئے۔ ہر وقت اپنے کمرے

میں دوستوں کے ساتھ بیٹھے شطرنج کھیلتے رہتے ہیں' یا پھر گراموفون بجتا رہتا ہے۔''

اس پر والدہ کہتیں۔ ''خبردار۔ بڑے بھائی کے بارے میں ایسا نہیں کہتے۔ گھر کے کام چھوٹے بچے ہی کیا کرتے ہیں۔'' اور بے چارہ شکائت کنندہ اردو میں آہ بھر کر رہ جاتا۔

ایک مرتبہ والد صاحب تک شکائت پہنچی تو انہیں یہ جان کر سخت حیرانی ہوئی کہ ان کی حکومت میں بچوں کے ساتھ ایسی ناانصافی ہو رہی ہے۔ چنانچہ حیران ہوتے ہی انہوں نے انصاف کرنے کے لئے ہمیں عین اس وقت طلب کرلیا جب ہمارا منتھا وزیر دشمن کی پیدل فوج کے ہاتھوں جام شہادت نوش کرنے والا تھا۔ ہم نے دشمن عزیز' میاں احمد جمال ہوش کو بتایا کہ میاں عین لڑائی میں وقت حساب آگیا ہے لہٰذا ہمارے محمود و ایاز کا ذرا خیال رکھیں' اور ہماری عدم موجودگی میں کوئی تبدیلی ہماری حربی حکمت عملی میں نہ فرمائیں نیز بادشاہ سلامت کو ذیق کرنے یا اردب میں ڈالنے کی سازشوں سے اجتناب برتیں۔ میاں ہوش سنی ان سنی کرکے اپنی ایک سال پرانی مونچھ کو دانتوں سے چبانے کی ناکام کوشش کرتے اور خطرناک انداز میں کچھ سوچتے رہے۔ ہم نے بھی حفظ ماتقدم کے طور پر کچھ دیر رک کر پوری بساط کو ذہن نشیں کیا اور سورہ فاتحہ پڑھتے ہوئے والد صاحب کے حضور میں حاضر ہوگئے۔ انہوں نے نہایت غصے میں فرمایا۔

''بڑے افسوس کی بات ہے کہ تم بڑے بھائی ہونے کا ناجائز فائدہ اٹھا رہے ہو۔ لہٰذا آج سے یہ طے کیا جاتا ہے کہ گھر کے لئے سبزی اور گوشت روزانہ.....'' پھر کچھ سوچ کر رک گئے اور بولے۔ ''میرا مطلب ہے کہ ہر دوسرے دن.....'' لیکن اس مرتبہ بھی رک گئے اور پھر کچھ سوچ کر بولے۔ ''چلو چھوڑو۔ ہفتے میں ایک دن۔ تم لایا کروگے! بس معاملہ ختم۔ اس کے آگے میں کچھ نہیں سنوں گا۔''

ہم نے سعادت مند بچوں کی طرح سر جھکالیا اور اپنے وزیر کی مدد کے لئے الٹے قدموں لوٹ گئے کہ میاں ہوش کا کچھ بھروسہ نہ تھا۔

ٹھیک ایک ہفتے بعد ہم نے والدہ سے کہا۔ ''فرمایئے۔ آج کیا پکے گا اور ہمیں بازار سے کیا لانا ہے۔''

یہ سنتے ہی انہوں نے شفقت سے ہمارے سر پر ہاتھ رکھا۔ کچھ دیر تک ہماری بلائیں لیں اور بولیں۔ ''جو تمہیں پسند ہو لے آؤ۔''

ہم نے کچھ لمحے سوچا اور کہا۔ ''گوشت میں شلغم ڈال لیجئے۔''

کہنے لگیں۔ ''نہیں بیٹے۔ کوئی اور اس سے اچھی چیز بتاؤ۔''

ہم نے پھر سوچا اور سوچ کر کہا۔ ''یہ نہیں تو شلغم میں گوشت ڈال لیجئے۔''

''نہیں کچھ اور بتاؤ میرے چاند۔'' انہوں نے پیار سے کہا۔

ہم نے ایک بار پھر غور سے سوچا' اور خوب سوچنے کے بعد کہا۔ "اچھا چلئے اور گوشت ایک ساتھ پکا لیجئے۔"

اس مرتبہ انہوں نے مسکرا کر منظوری دے دی اور ہم تھیلا اٹھا کر شلغم اور گوشت لانے چل دیئے!

گھر سے نکلنے کے بعد ہم سیدھے سبزی منڈی پہنچے اور ایک بڑی سی دکان کے آگے رک کر سبزیوں کو غور سے دیکھنے لگے۔ اتنی ساری سبزیاں دیکھ کر ہماری حیرت کا ٹھکانہ نہ رہا۔ اور ہم سوچنے لگے' یا الٰہی سبزیوں کی بھی اتنی قسمیں ہوتی ہیں۔ کچھ سبزیاں تو سرخ' سفید اور پیلے رنگ کی تھیں۔ لیکن سب سے زیادہ حیرت ہمیں اس سبزی کو دیکھ کر ہوئی جس کا رنگ بینگنی تھا۔

ہم نے حیرت رفع کرنے لئے دکاندار سے پوچھا۔ "یہ بینگنی سی کیا چیز ہے بھائی؟"

یہ سنتے ہی دکاندار ہمیں حیرت سے تکنے لگا اور جب خوب حیرت کر چکا تو عجیب سے لہجے میں بولا۔ "بینگن!"

ہم نے دل ہی دل میں لاحول پڑھی اور دکاندار سے اپنی آمد کا مقصد بیان کر دیا۔

"شلغم کیا بھاؤ ہیں؟" ہم نے پوچھا۔

"آٹھ آنے سیر..." اس نے کہا۔

"ٹھیک ہے دو سیر تول دو۔"

"لیکن شلغم اس وقت نہیں ہے۔ کہئے تو مولی دے دوں۔"

"نہیں مولی نہیں چاہئے۔ ایک سیر پالک دے دو۔"

"مگر پالک تو نہیں ہے۔ ہاں میتھی ہے..."

"اچھا تو پاؤ بھر ادرک دے دو۔"

"معاف کیجئے ادرک بھی نہیں ہے۔ البتہ ٹماٹر ہیں' بالکل تازہ۔"

"اور آلو؟"

"آلو ابھی نہیں آیا ہاں کدو ہے۔ کہئے تو....."

"نہیں اب کچھ نہیں کہنا ہے۔ عجب احمق ہو۔ اتنا وقت برباد کر دیا۔ پہلے بےتکلف نہیں بتایا کہ یہ سبزی کی دکان نہیں ہے!؟" ہم نے جھنجلا کر کہا اور آگے بڑھ گئے۔

ٔ ان دونوں کلو کے باٹ ترازو پر تو چڑھ چکے تھے زبان پر نہیں چڑھے تھے۔

اس سے بھی بڑی ایک سبزی کی دکان کے آگے رک کر پہلے ہم نے احتیاطاً دکاندار سے پوچھ لیا "کیوں بھائی؟ کیا یہ سبزی کی دکان ہے؟"

دکاندار ہمیں غصہ سے گھورنے لگا۔ تبھی ہماری نظر شلغم کی ٹوکری پر پڑ گئی۔ ہم نے سوچا بحث فضول ہے۔ لہٰذا ہاتھ سے اشارہ کر کے پوچھا "یہ کیا بھاؤ ہیں۔"

"چھ آنے سیر۔" دکاندار نے کہا۔

ہم نے دو آنہ فی سیر کی بچت سامنے دیکھ کر خوشی خوشی دو کی بجائے پانچ سیر شلغم تلوا لئے۔ پھر پالک کی ٹوکری سے ایک سیر پالک ترازو میں رکھوایا تو ساری خوشی کافور ہو گئی۔ کیونکہ اس کا بھاؤ چھ روپے سیر نکلا۔

خیر سبزی سے فارغ ہو کر ہم نے گوشت کی مارکیٹ کا رخ کیا۔ جیسے ہی میٹ مارکیٹ کے دروازے پر پہنچے' مارکیٹ میں ایک زلزلہ سا آگیا۔ لوگ اپنی دکانیں چھوڑ چھوڑ کر اٹھنے لگے۔ ہر طرف شور مچ گیا۔ "آیئے بابو جی۔" "آؤ بھائی جان" "اس طرف بھائی صاحب۔" "نہیں اس طرف بھائی میاں۔" کی صدائیں بلند ہونے لگیں۔ اسی افراتفری میں ایک صاحب نے اپنی دکان سے چھلانگ لگائی اور ہمارا ہاتھ پکڑ کر اپنی دکان کی طرف کھینچنے لگے۔

"اپنی دکان چھوڑ کر آپ کہاں جا رہے ہیں بھائی؟ میں تو کئی روز سے آپ کی راہ دیکھ رہا تھا۔ گھر میں تو سب خیریت ہے نا؟"

ہم انہیں بتانا چاہتے تھے کہ گھر سے سودا سلف لانے کے لئے آج ہم پہلی بار بازار میں نکلے ہیں لہٰذا ان کی اور ہماری واقفیت کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن انہوں نے اس کا موقع ہی نہیں دیا۔ بلکہ ہمارا سبزی کا تھیلا بھی یہ کہتے ہوئے چھین لیا کہ "آپ بھی کیا بات کرتے ہیں۔ لائیے تھیلا مجھے دیجئے۔ تھک گئے ہوں گے۔ لیجئے حقہ پیجئے۔"

"معاف کیجئے حقہ پینے کی ابھی ہماری عمر نہیں ہے۔" ہم نے کہا اور حقے کی نے جو تازہ چربی سے تربتر تھی ان کی طرف واپس سرکا دی۔

"بھئی یہ تو ماشاء اللہ بہت اچھی بات ہے۔ اچھا خیر بتایئے نواب صاحب کے مزاج کیسے ہیں۔ بہت دنوں سے ان سے ملاقات نہیں ہوئی۔"

"نواب صاحب کون؟" ہم چونک گئے۔

"بھئی آپ کے والد بزرگوار۔"

"معاف کیجئے جناب ہم نواب شواب نہیں ہیں..."

"میاں آپ ابھی بچے ہیں آپ کے والد ہمارے بچپن کے دوست ہیں۔ ہم اور وہ ایک ہی

اکھاڑے میں پہلوانی کرتے تھے۔ ان دنوں ان کا پیار کا نام نواب تھا۔ ہم انہیں نواب ہی کہتے تھے.....''

''مگر جناب ہمارے والد نے تو زندگی میں کبھی پہلوانی نہیں کی۔ کبھی کسی سے نہیں لڑے۔ پھر ان کا بچپن بھی اس شہر میں نہیں گذرا۔ ہم تو دراصل بلند شہر کے رہنے والے ہیں اور.....''

''اوہوں میاں میں بلند شہر کی ہی تو بات کر رہا ہوں۔ خیر یہ اگلے وقتوں کی باتیں ہیں میاں۔ یہ بتایئے کیا خدمت کروں آپ کی' بوٹی بناؤں یا قیمہ۔ انشاء اللہ مزا آجائے گا۔ ایسا لاجواب جانور کاٹا ہے آج جس کا کوئی جواب نہیں۔'' انہوں نے ہمارا تھیلا دوسرے گاہکوں کے تھیلوں کی قطار میں رکھتے ہوئے کہا۔

''قیمہ نہیں۔ بس صاف سا گوشت دے دیجئے۔ شلغم میں ڈالنے کے لئے۔'' ہم نے احتیاطاً وضاحت کردی۔

''اچھی بات ہے۔'' انہوں نے کہا اور پھر اپنے نوکر سے مخاطب ہو کر بولے۔ ''ہاں بھئی فضلو بیٹے۔ ذرا جلدی ہاتھ چلاؤ سارے گاہک انتظار کر رہے ہیں پہلے بھائی خلیل کا مغزہ (مغز) نکال لو' پھر چودھری رحمت علی کے پائے کاٹنے ہیں۔ اس کے بعد صدیق بھائی کا قیمہ بنانا ہے۔ اللہ بندے کی بوٹیاں کرتی ہیں۔ بندو خاں کے پارچے اتارنے ہیں اور سید صاحب کی زبان کاٹنی ہے۔ نئے بابو جی کا تمہیں کچھ نہیں کرنا ہے۔ ان کا کام میں کردوں گا۔ ہاں تو بابو جی آپ نے کیا کہا تھا؟ کیا کرنا ہے آپ کا؟''

''جی کچھ نہیں۔'' ہم نے سہم کر کہا اور اپنا تھیلا اٹھا کر وہاں سے بھاگ لئے۔ گھر جا کر ہم نے سب کو اپنی صحیح سلامت واپسی کا قصہ سنایا اور اعلان کردیا کہ آج سے کبھی گوشت لانے نہیں جائیں گے۔ صرف سبزی لا کر دے سکتے ہیں۔

لیکن جب تھیلا کھولا گیا تو ہمیں نہ صرف گوشت اور سبزی لانے سے بلکہ گھر کے تمام کاموں سے بری الذمہ کردیا گیا۔ وجہ اس کی یہ تھی کہ ہم شلغم کی جگہ چار سیر ٹنڈے اور پالک کی جگہ ایک سیر ہرا دھنیا اٹھا لائے تھے!

☆ ☆ ☆

مسئلہ تذکیر و تانیث

انگریزی زبان میں اور چاہے کتنی بھی خامیاں ہوں لیکن یہ بات بڑی اچھی ہے کہ اس میں تذکیر و تانیث کا مسئلہ اتنا شدید نہیں جتنا اردو میں ہے۔ مسئلہ تو خیر یہ ہندی زبان میں بھی ہے لیکن ہندی چونکہ راشٹر بھاشا ہے اس لیے اسے سات خون معاف ہیں۔ چنانچہ کوئی کچھ نہیں بولتا۔ جس کے جو جی میں آتا ہے کہتا رہتا ہے۔ جب کہ اردو والے اتنے ذکی الحس واقع ہوئے ہیں کہ اگر کوئی کسی لفظ کی تذکیر یا تانیث میں ایک مرتبہ گڑبڑ کردے تو ناراض اور دوسری یا تیسری مرتبہ کردے تو بے ہوش ہو جاتے ہیں۔

انگریزی کا معاملہ خوب ہے۔ فری اسٹائل زبان ہے۔ جو بھی جس طرح چاہے بول اور لکھ پڑھ سکتا ہے۔ شیڈول Schedule کو آپ آرام سے اسکیڈول بولیے کوئی کچھ نہیں کہے گا۔ اور اگر کہے بھی تو پورے رعب سے کہہ دیجئے یہ امریکن انگلش ہے، مجال ہے جو کوئی چوں بھی کرجائے (امریکہ کے آگے تو اب چین بھی چوں نہیں کرتا صرف چیں کرکے رہ جاتا ہے)۔ پھر کسی اور محفل میں اسی لفظ کو اپیڈول کہہ دیجئے۔ وہاں بھی کوئی زبان کھولے تو یہ کہہ کر ڈانٹ دیجئے کہ چپ! خبردار!! یہ جرمن انگلش ہے۔ پھر دیکھئے کس طرح سب کے سب ٹھنڈے پڑجاتے ہیں۔ عربی میں یہی لفظ مزے سے جدول بولا جاتا ہے۔ مگر خیر، انہیں کون کچھ کہہ سکتا ہے۔ وہ تو اسے اپنی ہی زبان کا لفظ مانتے ہیں۔ ویسے بھی ان کا اصول ہے کہ سب کچھ اپنے حساب سے اور مزاج سے بولتے ہیں اور نہیں بھی بولتے ہیں۔

مثلاً -- عربی میں ''گ'' نہیں ہے پھر بھی بولتے ہیں۔ اور ''ج'' ہے پھر بھی نہیں بولتے۔ بلکہ ''ج'' کی جگہ بھی ''گ'' بولتے رہتے ہیں۔ اس مثال کی ایک مثال یہ ہے کہ جمال عبدالناصر کو عرب والوں نے ہمیشہ گمال عبدالناصر کہا اور اللہ جل جلالہ کو آج بھی اللہ گل گلالہ کہتے ہیں۔ یعنی ظالموں کو خدا

کا بھی خوف نہیں۔

تاہم الفاظ' املا اور تلفظ کی ہیرا پھیری میں انگریزی تمام زبانوں سے آگے ہے۔ انگریزی ڈکشنریاں مرتب کرنے والوں کا عجیب حال ہے۔ انہوں نے بھی خوب خوب کمال دکھائے ہیں۔ یہاں کا لفظ وہاں اور وہاں کا لفظ نہ جانے کہاں ڈال دیا ہے۔ چنانچہ ہوتا یہ ہے کہ "نائف" یعنی چاقو "ک" کے تحت ملتا ہے تو نمونیہ "پ" کے باب میں۔ اسی طرح سائکالوجی (نفسیات) ہونی چاہیے "س" کے تحت مگر وہ ملے گی "پ" کے ماتحت' جب کہ اسی باب میں آپ سائیکل ڈھونڈیں گے تو کہیں نہیں ملے گی۔ وہ ملے گی اس حرف کے تحت جو پکارا تو "سی" کے نام سے جانا جاتا ہے مگر آواز دیتا ہے کبھی "ک" کی تو کبھی "چ" کی اور کبھی "س" کی۔ چنانچہ آپ کو سائیکل کے علاوہ کیٹ یعنی بلی بھی اسی میں ملے گی اور "چارٹ" یعنی نقشہ بھی وہیں نظر آئے گا۔ یہاں تک کہ شراڈ (Charade) یعنی چیستاں بھی اسی میں مل جائے گا۔

لہٰذا یہی وجہ تھی کہ ایک مشہور لطیفے میں کیمسٹری کو چیمسٹری بولنے والے چوپڑا جی کو ایک انگریز نے جل بھن کر مسٹر کھوپڑا کہنا شروع کر دیا اور مسٹر چوپڑا اس کا کچھ بھی نہ کر سکے۔

یہی حال "جی" (G) کا بھی ہے۔ اس حرف کا کوئی ٹھکانہ نہیں کب کیا آواز نکال دے۔ کسی لفظ کے شروع میں آئے گا تو عام طور پر "گ" کی آواز دے گا۔ لیکن جغرافیہ اور جیرئیل بھی اسی کے تحت مل جائیں گے۔ یہی "جی" بیچ میں آئے تو الجبرا میں "ج" کی اور میگنٹ (مقناطیس) میں "گ" کی آواز دے گی۔ لیکن ایچ کے ساتھ مل جائے تو کبھی "ف" بن جائے گی (جیسے رف- Rough) اور کبھی بالکل ہی غائب ہو جائے گی (جیسے ہائی- High)۔

لیکن اس تمام گڑبڑ گھوٹالے کے باوجود انگریزی میں تذکیر و تانیث کے معاملے میں کوئی ایسی خاص پیچیدگی نہیں ہے۔ سیدھا سادا حساب ہے "ہی" مذکر ہوتی ہے اور "شی" مونث ہوتا ہے۔ اس حساب سے جانداروں میں نر مذکر ہے اور مادہ مونث۔ مگر بے جان چیزیں نہ مذکر ہوتی ہیں نہ مونث۔ بس "دس" اور "دیٹ" کے دائرے میں گھومتی رہتی ہیں۔ البتہ بحری جہاز اور ملکوں کے لیے جنس مقرر کر دی ہے اور ان کے لیے "شی" اور "ہر" کا استعمال کیا جاتا ہے۔ چنانچہ جہاز دخانی ہو یا ملک افریقی' انگریزی میں مونث ہی رہیں گے۔

مگر ایک لطف کی بات ہے۔ جانداروں کے لیے اگرچہ انگریزی میں تذکیر اور تانیث کا پورا خیال رکھا جاتا ہے۔ تاہم خود اپنی جنس انگریز حضرات کبھی نہیں بتاتے۔ حالانکہ جنسی معاملات میں وہ خاصے آزاد خیال سمجھے جاتے ہیں۔ انگریز اور انگریزی داں حضرات جب بھی فرسٹ پرسن میں بات کرتے ہیں تو اپنی جنس پر ایسا پردہ ڈال دیتے ہیں کہ پتہ ہی نہیں چلتا وہ بول رہا ہے یا بول رہی ہے۔ "میں آیا ہوں" اور "میں آئی ہوں" دونوں کی انگریزی' انگریزی زبان میں ایک ہے۔ "آئی ہیو کم!"

کے یہ دونوں کردار تو ان سے پہلے پطرس بخاری اور مشتاق حسین یوسفی (علی الترتیب) برت چکے ہیں۔ ان سے تو ان کی انفرادیت پر حرف آتا ہے۔ یہ نہ ہوتے تو اچھا ہوتا۔ مگر اس کے باوجود لفظوں کے پیچ و خم، مکالموں کی جو اکھیڑ پچھاڑ اور جملوں کی جو دھر پکڑ ان کے مضامین میں لطف اور کبھی کبھی حوصلہ دیتی ہے، وہ ان کی اپنی اپج ہے، جس کو کوئی مرزا کوئی عبدالقدوس ماند نہیں کر سکتا۔

نصرت ظہیر کا مزاح زود ہضم قسم کا مزاح ہے مگر اس کے لئے جس زود حسی اور تازگی احساس کی ضرورت ہے اس کی فراہمی بہت دشوار ہے۔ یعنی پڑھیں تو ایسا لگے کہ ہم خود بھی ایسا بلکہ اس سے بہتر لکھ سکتے ہیں۔ لیکن جب قلم لے کر بیٹھیں تو اپنے کو عاجز اور بے بس پائیں قلم ایک جنبش آگے نہ بڑھے اور دنیا انگلیوں میں اندھیر ہو جائے اور اس پر بھی اصرار کر کے دو چار جملے لکھیں تو وہ مضحکہ خیز تک اپنی ناکامی اور نامرادی کا اعلان کرنے لگیں۔

نصرت ظہیر کی شادابی فکر اس اعتبار سے قابل رشک ہے کہ وہ ہماری آپ کی زندگی کے اردگرد سے موضوعات اٹھاتے ہیں اور پھر انہیں تجربات اور مشاہدات کی چمکتی دھوپ میں لا کر رکھ دیتے ہیں اور خود کو کم و بیش "معمول" کی سطح پر لے آتے ہیں۔ گویا بولنے والے یہ خود ہیں مگر بلوانے والا کوئی اور ہے۔ اور اس تکنیک سے گویا آورد کی مدد سے آمد پیدا کرتے ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ان کے اکثر مضامین میں ایک وارفتہ قسم کی بے تکلفی چھائی ہوئی ہے جو اردو طنز و مزاح میں بھی ایسی اور اتنی ارزاں نہیں ہے جتنی عام طور پر سمجھی جاتی ہے۔

نصرت ظہیر کے انشائیے ہمارے منقسم اور متصادم معاشرے میں معقولیت کا حرف احتجاج ہیں۔ جب معاشرہ بہت الجھ جاتا ہے اور فرد کی جائز خواہشات اور ارمانوں سے تقریباً متصادم سا ہونے لگتا ہے تو افراد کا اور خاص طور پر سوچنے سمجھنے والے افراد کا قافیہ تنگ اور حال بے حال ہوتا ہے۔ قدریں ایک دوسرے سے ٹکراتی ہیں اور ارمانوں اور آرزوؤں کے فلک بوس محل زلزلے میں آجاتے ہیں اور احساس اور ادراک والوں کی نظروں کے سامنے دیواروں پر مایوسی کے سائے ہاتھ پھیلائے رقص کرنے لگتے ہیں۔ اچھے خاصے معقول اور سمجھ دار لوگ بھی خودکشی اور موت کے موضوعات پر سوچنے لگتے ہیں یا پھر شکست خوردگی کی نذر ہو جاتے ہیں۔

جی ہاں! نصرت ظہیر کے مزاحیہ انشائیے بھی ایسے ہی جاں کاہ دور کی تخلیق ہیں۔ آنکھوں میں آنسو اور دل میں اتھاہ درد لئے یہ فن کار ہنسنے اور ہنسانے کے بہانے جینے اور جیتے رہنے کا جواز تلاش کر رہا تھا۔ وہ جو حافظ نے کہا تھا۔

بیا کہ رونق ایں کارخانہ کم نشود
بزہد ہم چو توئی یا بفسق ہمچو منے

یہی وجہ ہے کہ ہم انگریزی کے ان ادبی افسانوں اور ناولوں کا مطالعہ عموماً نہیں کرتے جو صیغہ واحد متکلم میں لکھے گئے ہوں۔ کیونکہ ان میں مسئلہ یہ رہتا ہے کہ ہم آدھی کہانی (اور کبھی کبھی تو پوری کہانی) پڑھ کر بھی یہ نہیں سمجھ پاتے کہ بیان کرنے والا مذکر ہے یا مونث، تاوقتیکہ کہانی میں اس کے شوہر یا بیوی کا ذکر نہ آجائے۔

فرسٹ ہی نہیں سیکنڈ پرسن اور کبھی کبھی تھرڈ پرسن کی جنس بھی واضح نہیں ہوپاتی۔ چنانچہ تم آئے ہو، یا تم آئی ہو اور وہ آئے ہیں یا وہ آئی ہیں کو بھی ایک ہی طرح سے بولا اور لکھا جاتا ہے۔ اس طرح کہا جاسکتا ہے کہ انگریزی میں بیشتر اشخاص کی جنس غیر واضح رہتی ہے اور اس کا صرف دوسری علامتوں سے ہی ٹھیک ٹھیک پتہ چل پاتا ہے۔

لیکن کبھی کبھی دوسری علامتیں بھی غیر واضح ہوتی ہیں۔ ایک مرتبہ میاں عبدالقدوس نے نوعمر انگریز سیاحوں کی ایک ٹولی کو کناٹ پلیس میں دیکھا تو بولے۔۔۔

"یہ بھی عجیب لوگ ہیں۔ اوپر سے دیکھنے میں پتہ ہی نہیں چلتا کہ ہیوں میں ہیں یا شیوں میں۔؟"

بچپن میں غلطی سے ایک مرتبہ ہم نے اسکول کی کلاس میں ماسٹر صاحب سے پوچھ لیا کہ جناب طوطا مذکر ہے یا مونث؟ اس کی سزا یہ ملی کہ ماسٹر صاحب نے ہمیں زور سے گھور کر دیکھا اور بنچ پر کھڑا کردیا۔ جب پیریئڈ ختم ہوا تو پاس آئے اور ہمارا کان پکڑ کر بولے۔۔۔

"اگر طوطا بول رہا ہو تو مذکر ہے اور بول رہی ہو تو مونث! سمجھے؟ اب بیٹھ جاؤ اور گرامر یاد کرو۔"

اس روز ہم تمام دن یہی سوچتے رہے کہ یا اللہ! یہ کیسے پتہ چلے گا کہ طوطا بول رہا ہے یا بول رہی ہے۔

ان ہی دنوں گھر پر ایک دن گرامر کا سبق یاد کرتے کرتے ہم گھر میں آئی ہوئی دور کے رشتے کی ایک بزرگ خالہ سے پوچھ بیٹھے۔

"خالہ اماں آپ مذکر ہیں یا مونث؟"

یہ سنتے ہی خالہ اماں نے ہماری کمر پر دو ہتڑ جمادیئے اور بولیں۔

"ہٹ موئے۔۔۔ دو بالشت کا چھوکرا اور بوڑھی بیوہ سے مذاق کرتا ہے؟ آتو سہی، ابھی تیری ہڈی پسلی ایک کرتی ہوں۔"

وہ دن اور آج کا دن ہم نے دوبارہ کبھی کسی سے اس کی جنس معلوم کرنے کی کوشش نہیں کی۔

دراصل جیسا کہ ہم عرض کرچکے ہیں، اردو میں تذکیر و تانیث کا مسئلہ بڑا ٹیڑھا، نازک اور پیچیدہ ہے۔ ہمارے ہاں، انگریزی کے برعکس، جانداروں کے علاوہ بے جان چیزوں کے لیے بھی تذکیر و تانیث طے کرنی پڑتی ہے اور مشکل یہ ہے کہ وہ بھی کسی طے شدہ اصول کے بغیر!

ویسے موٹے طور پر بے جان چیزوں کی تذ و تانیث طے کرنے کے لیے اس آمرانہ' جا دارانہ اور سرمایہ دارانہ اصول کی پابندی کی جاتی ہے کہ جو چیز دیکھنے میں بڑی اور طاقتور ہو وہ مذکر اور چھوٹی اور کمزور ہو وہ مونث۔ مثلاً بڑا لوٹا مذکر ہے لیکن چھوٹا لوٹا مونث ہو کر لٹیا بن جاتا ہے۔ اسی طرح پراٹھا مذکر ہے تو روٹی مونث اور چپاتی اور بھی زیادہ مونث۔

اور بھی سیکڑوں چیزیں ہیں جیسے پہاڑ اور پہاڑی' دریا اور ندی' شہر اور بستی' محل اور جھونپڑی وغیرہ وغیرہ۔ لیکن یہاں بھی ایک قباحت ہے۔ پہاڑی پہاڑ سے چھوٹی ہوتی ہے لیکن ٹیلہ پہاڑی سے چھوٹا ہوتا ہے پھر بھی مذکر کہلاتا ہے۔ اسی طرح ندی کے مقابلہ میں نالہ' بستی کے مقابلہ میں محلّہ اور جھونپڑی کے مقابلے میں گھونسلہ چھوٹا ہونے پر بھی مذکر بن جاتا ہے۔

ٹرک' کار اور ٹمپو

کوٹ قمیص اور بنیان

تہمد' پتلون اور نیکر

قالین' دری اور غالیچہ

تربوز' نارنگی اور آلو بخارا

یہ چند مثالیں ہیں جن میں بڑی چیز مذکر ہے' اس سے چھوٹی مونث مگر مونث سے چھوٹی اور کمزور پھر مذکر بن گئی ہے۔

پھر کئی معاملوں میں بڑے اور چھوٹے کی بھی تمیز نہیں ہے۔ مثلاً دہلی کی شاہجہانی جامع مسجد بڑی ہونے پر بھی مونث ہے جب کہ اس کے قریب جین بھائیوں کا چھوٹا سا لال مندر مذکر کہلاتا ہے۔

کرسی اور اسٹول' کتاب اور کتابچہ' رضائی اور کمبل اور دہلی و ہونولولو' کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہے کہ مونث بڑی ہے اور مذکر چھوٹا!

اب آپ ہی بتائیے' ان حالات میں تذکیر و تانیث طے کرنے کا کوئی واضح اصول کیسے بن سکتا ہے۔ پھر ایک جھگڑا یہ ہے کہ لوگوں نے خود بھی اپنی اپنی تذکیر و تانیث طے کر رکھی ہیں۔ مثلاً دہلی میں جو یوپی والے ہیں وہ دہلی انتظامیہ کو مذکر مانتے ہیں جب کہ بہار کی طرف کے لوگ اسے مونث کہتے ہیں۔ اور جو لوگ نہ یہاں کے ہیں نہ وہاں کے وہ سرے سے اس کے وجود کو ہی نہیں مانتے۔ اکثر پوچھتے رہتے ہیں کدھر ہے دہلی انتظامیہ کہاں ہے میونسپل کارپوریشن؟

ویسے مشرقی یوپی اور بہار کی طرف کے اردو دانوں کی بات ہی الگ ہے۔ یہ لوگ اردو کے معاملے میں پورے انگریز ہیں اور اسے اپنی مرضی سے جس طرح چاہتے ہیں' استعمال کرتے رہتے ہیں۔ تذکیرو تانیث کی بات تو جانے دیں' واحد اور جمع کا بھی خیال نہیں رکھتے۔

ایک صاحب ہیں' غالباً بہار کی طرف کے' جو ریڈیو پر کرکٹ کی کمنٹری سناتے ہیں۔ کھیل کا حساب وہ ہمیشہ اس طرح بتاتے ہیں کہ "سری کانت نے ۸۵ رن بنایا ہے اور شاستری کے ایک رن بنے ہیں۔ مظفر نگر نے' معاف کیجئے' مدثر نذر نے چھ اوور گیند پھینکا ہے اور وسیم اکرم کے ابھی ایک اوور پورے

ہوئے ہیں۔ اس وقت دوپہر کا سوا بارہ بجا ہے اور امید کرنی چاہئے کہ جب ایک بجیں گے اور لنچ کے بعد کی کھیل شروع ہوگی تب تک وکٹ اور دھیما کھیلنے لگے گی۔ تو آیئے تب تک میں آپ کو اسٹوڈیو واپس لئے چلتی ہوں۔ معاف کیجئے چلتا ہوں!"

تذکیر اور تانیث کا کوئی واضح اصول نہ ہونے کی ہی وجہ ہے کہ اردو کے ہزاروں ادیب اور شاعر لاکھ سر مارنے پر بھی آج تک بلبل جیسے حقیر و فقیر پرندے کی جنس طے نہیں کرپائے ہیں۔ بلبل کی جنس پر اتنے ادبی جھگڑے اور فساد برپا ہو چکے ہیں کہ کچھ نہ پوچھئے۔ شاعروں نے اپنی اپنی ضرورت اور قافیہ ردیف یا مضمون کی مناسبت سے اسے مذکر اور مونث دونوں طرح باندھا ہے۔ کسی شاعر کے جی میں آیا تو اس نے کہہ دیا۔

دھیرے دھیرے آرے بادل دھیرے دھیرے آ
میرا بلبل سورہا ہے شور و غل نہ مچا

اور کسی دوسرے شاعر کی طبیعت آئی تو اس نے لکھ دیا۔

ایک تھا گل اور ایک تھی بلبل دونوں چمن میں رہتے تھے

پھر یہ خیال کر کے کہ بات بالکل پکی ہو جائے اس سلسلہ میں اپنے بزرگ کا حوالہ دیتے ہوئے یہ مصرعہ لگا دیا کہ۔

ہے یہ کہانی بالکل سچی میرے نانا کہتے تھے!

ایک مرتبہ ہم نے مسئلہ بلبل کے سلسلہ میں میاں عبدالقدوس سے رجوع کیا تو انہوں نے فرمایا---

"تذکیر و تانیث مزاج اور تغزل کا معاملہ ہے۔ جہاں تک بلبل کی جنس کا تعلق ہے تو اپنے موقف کی تائید میں ایک مرتبہ میں نے یہ شعر فی البدیہہ کہا تھا۔

ان کا جو صیغہ ہو وہ اہل گرامر جانیں
میرا بلبل تو مونث ہے' جہاں تک پہنچے!

امید ہے اس سے میرا موقف واضح ہو گیا ہو گا۔"

"لیکن آپ نے مونث بلبل کو بھی میرا کہا ہے۔ اس سے بات پھر الجھ گئی ہے۔"

"الجھ نہیں گئی الجھائی گئی ہے اور اسی کو استادی کہتے ہیں۔ بہرکیف بلبل کے مسئلے کا حل میرے نزدیک یہ ہے کہ بلبل کو مونث مان لیا جائے۔"

"تو پھر مذکر بلبل کو کیا کہیں گے؟" ہم نے پوچھا۔

"بلبلہ!" انہوں نے جواب دیا۔

☆ ☆ ☆

ڈاکٹر

چند باعزت پیشے ایسے ہیں جن کی ہمارے سماج میں بڑی عزت کی جاتی ہے۔ مثلاً ڈاکٹری، وکالت، صحافت اور سیاست۔

ویسے کہنے کو تو شاعری بھی ایک باعزت پیشہ ہے۔ لیکن اس کا شمار ان باعزت پیشوں میں ہوتا ہے جن کی سماج میں ذرا بھی عزت نہیں ہوتی۔ آپ نے کبھی کسی شاعر کو صرف شاعری کی بدولت اس کی زندگی میں پنپتے نہیں دیکھا ہوگا۔ پھر چاہے وہ بشیر بدر ہی کیوں نہ ہو۔ پنپنے کے لئے اردو شاعر کو مابعد الشعری سہاروں کا سہارا لینا ہی پڑتا ہے۔

اردو کا شاعر اگر بشیر بدر نہ ہو تو ہمیشہ مرنے کے بعد پنپتا ہے۔ جب شاعر مرجاتا ہے تب اس کی شاعری زندہ ہوتی ہے۔ اور اسے ادب میں کوئی مقام دیا جاتا ہے۔ اخباروں میں مضامین چھپتے ہیں، بڑے بڑے ادیب مرحوم شاعر کے ساتھ ذاتی تعلقات کا حوالہ دے کر اپنی شان میں زمین آسمان کے قلابے ملاتے ہیں۔ مرحوم کی یاد میں رسالوں کے خاص نمبر چھپتے ہیں۔ یادگاری مشاعرے کرائے جاتے ہیں۔ سیمینار ہوتے ہیں، ایوارڈ قائم کئے جاتے ہیں اور جانے کیا کیا ہوتا ہے۔

لیکن جن باعزت پیشوں کا ذکر اوپر کیا گیا ہے ان میں ایسی بات نہیں ہے۔ ان میں پیشہ کرنے والا اپنی زندگی میں ہی زندہ رہنے لگتا ہے اور کبھی کبھی تو اتنا زندہ رہنے لگتا ہے کہ رہے نام اللہ کا!

ڈاکٹر کے پیشے کو ہی لے لیجئے۔ پولس کے بعد ڈاکٹری واحد پیشہ ہے جس میں آپ سیاہ کیجئے یا سفید۔ کوئی پوچھنے والا نہیں۔ تھانہ ہو یا کلینک جب بھی ان کے قریب سے گذریئے تو اندر سے آہ و بکا زیادہ سنائی دے گی۔ تھانے میں قیدی کراہ رہے ہوں گے۔ کلینک میں مریض آہ بھر رہے ہوں گے۔ یہی

وجہ ہے کہ اس دوران اگر، قتل بھی ہو جائے تو چرچا نہیں ہوتا۔

آپ کہیں گے یہ کیا بات ہوئی۔ تھانے میں تو کبھی کبھار پولس کی حراست میں کوئی موت ہو بھی جاتی ہے۔ مگر کلینک میں قتل چہ معنی دارد؟

تو حضور بات دراصل یہ ہے کہ ڈاکٹر وہ واحد سول مخلوق ہے جس کے ہاتھوں ہونے والی موت کو آپ کسی عدالت میں چیلنج نہیں کر سکتے۔ ہاں اگر موت کے بعد مریض کے جسم میں کوئی ٹھوس ثبوت۔ مثلاً ڈاکٹری قینچی یا نشتر وغیرہ باقی رہ جائے تو بات دوسری ہے۔ اس صورت میں ڈاکٹر کا اسسٹنٹ یا نرس وغیرہ پھنس سکتے ہیں۔

تعلیمی لیاقت کے معاملے میں بھی ڈاکٹر اور پولس والے ایک جیسے ہوتے ہیں۔ پولس والا جس قدر کم تعلیم یافتہ ہوگا، علاقہ میں اسی قدر زیادہ اس کا رعب و دبدبہ ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ پولس میں بھرتی کے لئے کم از کم تعلیمی لیاقت میٹرک فیل ہوتی ہے۔

ڈاکٹر اس معاملے میں ان سے دو قدم آگے ہیں۔ ان کے یہاں کم از کم تعلیمی لیاقت اس قدر کم رکھی گئی ہے کہ آدمی کا زیادہ سے زیادہ پانچویں فیل ہونا بہت ہے۔ چنانچہ ہر وہ شخص جو ڈاکٹروں کے انداز میں ٹیڑھے میڑھے دستخط کرنا جانتا ہو بڑے آرام سے آر۔ ایم۔ پی٭۔ بن سکتا ہے۔

ڈاکٹروں کے انداز تحریر کا معاملہ بھی عجیب ہے۔ عموماً ڈاکٹر اپنی ڈگریوں سے نہیں انداز تحریر سے پہچانا جاتا ہے۔ ڈاکٹر جتنا بڑا ہوتا ہے اس کا انداز تحریر اتنا ہی خراب ہوگا۔ چنانچہ تاریخ گواہ ہے کہ ڈاکٹروں میں کوئی کاتب نہیں پیدا ہوا اور کاتبوں میں کوئی ڈاکٹر نہیں گذرا۔ اچھا ڈاکٹر وہ ہوتا ہے جس کا تحریر کردہ نسخہ صرف اس کے کمپوڈر یا دوا فروش کی سمجھ میں آئے۔ لیکن بہت اچھا ڈاکٹر وہ ہوتا ہے جس کا نسخہ کسی کی سمجھ میں نہ آئے۔

ایسا ڈاکٹر اگر غلطی سے کوئی غلط دوا تجویز کرکے اسے نقصان اور خود کو فائدہ پہنچا بیٹھے اور معاملہ پولس عدالت تک پہنچ جائے تو ٹیڑھے میڑھے دائروں میں لکھے گئے یہ نسخے بہت کارآمد ثابت ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر کے لئے!

لیکن ہمارے محلے میں ایک ڈاکٹر صاحب کا معاملہ سب سے الگ ہے۔ وہ اتنے گنجلک انداز میں نسخہ تحریر کرتے ہیں کہ کمپوڈر اور دوا فروش تو کیا دوبارہ پڑھنے پر خود ان کی سمجھ میں بھی نہیں آتا۔ لہٰذا مریض کے دوبارہ آنے پر اس کا نسخہ دیکھنے کے بعد وہ ملیریا کی جگہ کالی کھانسی کی اور نمونئے کی جگہ ٹی بی کی دوا تجویز کردیتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کمپوڈر کوئی تیسری دوا تھما دیتا ہے۔ اور مریض چوتھے دن اچھا

٭ رجسٹرڈ میڈیکل پریکٹیشنر، یعنی کسی کو بھی نسخہ دے کر ہلاک کرنے کا سرکاری اجازت نامہ۔

ہو جاتا ہے!

ایک اور ڈاکٹر ہیں، جو ہیں تو ڈاکٹر لیکن طب یونانی میں بھی مداخلت کرتے رہتے ہیں۔ ان کے نسخے عموماً اردو میں ہوتے ہیں۔ ایک روز ہم ان سے نزلہ کا علاج کرانے گئے۔ انہوں نے جھٹ اپنا قلم نکال کر ایک نسخہ رقم کر دیا اور پوری رقم وصول کرنے کے بعد فرمایا کہ ہم فلاں عطار کی دکان سے نسخہ میں لکھی ہوئی دوا لے لیں۔

ہم لشتم پشتم فلاں عطار کی دکان پر پہنچے اور احتیاطاً عطار کا نام پوچھ کر دکان کے بورڈ پر لکھے ہوئے نام سے ملا لیا تاکہ یہ امر یقینی ہو جائے کہ وہ خود عطار ہے، اس کا لونڈا نہیں جو اکثر لوگوں کو بیمار کر دیا کرتا ہے۔

''فرمایئے آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔'' عطار نے پوچھا۔

''ایک چھٹانک کل ہ نفسہ وانہ الا یحمی دے دیجئے۔'' ہم نے نسخہ پڑھ کر تمام اعراب کے ساتھ کہا۔

عطار اس عربی دوا کا نام سنتے ہی چکر کھا گیا۔ جب خوب چکر کھا چکا تو اس نے نسخہ ہمارے ہاتھ سے لیا اور اطمینان کا سانس لے کر گل بنفشہ اور دانہ الائچی کی پڑیا ہمارے ہاتھ میں تھما دی۔

اس روز ہمیں پتہ چلا کہ ان ڈاکٹر صاحب اور فلاں عطار میں کس قسم کے تحریری تعلقات تھے اور دونوں کی دکانداری خوب چلنے کا کیا راز تھا۔

عام طور سے ڈاکٹروں کی کامیابی میں وہی اصول کارفرما ہوتا ہے جو جھاڑ پھونک کرنے اور تعویذ گنڈے دینے والوں کی کامیابی میں ہوتا ہے۔

مولوی صاحب کے پاس آکر اگر دس سائل اپنے مسائل بیان کریں اور مولوی صاحب ان سب کو ایک ایک تعویذ دیں تو چند روز بعد ان میں سے کم از کم ایک کا مسئلہ تو حل ہو ہی جائے گا۔ بس جس کا مسئلہ حل ہو گا وہ یہ دیکھے بغیر کہ مسئلہ اس کی کوشش سے حل ہوا ہے یا اپنے آپ سلجھ گیا ہے، سارا کریڈٹ مولوی صاحب کے تعویذ کو دے گا اور ہر طرف ان کا گن گان کرتا پھرے گا۔ نتیجہ یہ ہو گا کہ اگلی جمعرات کو مولوی صاحب کے پاس بیس آدمی تعویذ لینے پہنچ جائیں گے۔

باقی رہے وہ نو افراد جن کے مسئلے حل نہیں ہو پائے، تو وہ مولوی صاحب کے تعویذ کی بجائے اپنی تقدیر کو روتے پھریں گے کہ ہائے کیسی نحوست چھا گئی ہے کہ مولوی صاحب کا تعویذ بھی بے اثر ہو گیا۔ یہ

لوگ دسویں سائل کی کامیابی سے متاثر ہو کر دوبارہ مولوی صاحب کے پاس پہنچیں گے اور تب تک ان سے تعویذ لیتے رہیں گے جب تک ان کے دن نہیں پھر جاتے۔ نتیجہ یہ ہو گا کہ تعویذ پورے شہر میں سکہ رائج الوقت کی طرح پھیل جائیں گے اور مولوی صاحب دو سال میں تین کوٹھیاں کھڑی کر کے چوتھی بیوی گھر میں لانے پر غور کرنے لگیں گے۔

یہی ڈاکٹروں کے ساتھ ہوتا ہے۔ مریض ٹھیک تو ہوتا ہے پرہیز سے یا اس وجہ سے کہ ڈاکٹر کا نسخہ غلط تھا۔ مگر واہ واہ ہوتی ہے ڈاکٹر کی۔ عورتیں بھی گھروں میں کچھ اس طرح کی باتیں کرتی ہیں۔

"کیا بات ہے رقیہ، کئی روز سے تمہاری شکل نہیں دکھائی دی۔"

"کیا بتاؤں بی بی، نعیمہ کے ابو کو پچھلی جمعرات سے دائمی نزلہ چل رہا ہے۔ نہ خود کچھ کرتے ہیں نہ کسی کو کرنے دیتے ہیں۔ ہر وقت بس چھینکتے رہتے ہیں۔ پورے گھر کا نام میں دم ہے۔ ذرا ایک کٹوری چینی تو دینا۔"

"ائے ہے۔ اللہ خیر کرے۔ دائمی نزلہ تو کم بخت بہت موذی چیز ہے۔ کل مجھے بھی ہو گیا تھا۔ اصل میں آج کل ہوا ہی کچھ ایسی چل رئی ہے۔ موسم بدل رہا ہے نا! اچھا یہ تو بتاؤ علاج کس کا چل رہا ہے۔ اور وہ پچھلی کٹوری واپس نہیں بھجوائی تم نے۔"

"علاج تو بہن نعیمہ کے ابو کا ہی چل رہا ہے مگر کٹوری میں نے شرفو کے ہاتھ واپس بھجوادی تھی۔"

"میرا مطلب یہ ہے کہ دوا کس کی چل رئی ہے۔ اور شرفو کی تو میں نے ایک ہفتے سے شکل بھی نہیں دیکھی۔"

"کہہ تو رئی ہوں بی بی۔ دوا نعیمہ کے ابو کی چل رئی ہے۔ اور شرفو تو آیا تھا۔ تم نے پہچانا نہیں ہو گا۔ کم بخت کا روز منہ دھلاتی ہوں۔ مگر نہ جانے کہاں گارے مٹی میں کھیل کر پھر منہ سڑا لیتا ہے۔"

"اوہو۔ بھئی میں یہ پوچھ رئی ہوں کہ علاج کس ڈاکٹر سے کرا رئی ہو۔ اور شرفو کو ایسے مت کھیلنے دیا کرو، آج کل زمانہ بہت خراب چل رہا ہے بہن!"

"ڈاکٹر مجید کو دکھایا تھا۔ اسی کی دوا چل رئی ہے۔ اللہ کا شکر ہے پانچواں دن ہے۔ رات کی چھینکیں تو کم ہو گئی ہیں۔ اللہ نے چاہا تو اگلے ہفتے تک دن کا چھینکنا بھی کم ہو جائے گا۔ اب تم ہی بتاؤ بی بی کیا کروں۔ تمہیں تو پتہ ہی ہے۔ سرکاری اسکول میں بٹھایا تھا۔ مگر وہاں سے بھی بھاگ نکلا۔ بالکل اپنے بڑے بھائیوں پر گیا ہے۔"

"کون؟ ابو۔"

"نہیں شرفو۔ تم بھی کیا مذاق کرتی ہو۔"

"مگر تم سے بھی حد ہے رقیہ۔ کب تک ایک ہی ڈاکٹر سے پورے گھر کا علاج کراتی رہو گی؟ کچھ پتہ بھی ہے۔ پلکھن تلے میں ایک نیا ڈاکٹر آیا ہے۔"

"کون؟ وہ اٹھنی والا ڈاکٹر؟"

"ہاں وہی۔ میری نند کی بھاوج کی لڑکی کو نمونیہ ہو گیا تھا۔ سارے ڈاکٹروں نے جواب دے دیا۔ مگر اٹھنی والے ڈاکٹر نے ایسی پڑیا دی کہ ایک ہی خوراک میں نمونیہ ختم ہو گیا۔"

"مگر میں نے تو سنا ہے بچی اب بھی بیمار ہے۔"

"ہاں۔ ہے تو سہی۔ مگر نمونیہ کے بعد بے چاری کی پسلیاں چلنے لگیں۔ وہ بیماری ختم ہوئی تو خسرہ نکل آئی۔ لیکن خسرہ بھی ایک پڑیا سے ختم ہو گئی۔"

"اور اب؟"

"اب تو خدا کے فضل سے ٹھیک ہے۔ بس کالی کھانسی کی دوا چل رہی ہے۔"

طب میں مرض کی تشخیص کو علاج سے زیادہ اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ اگر مرض کی تشخیص صحیح طور پر ہو جائے تو علاج ذرا بھی مشکل نہیں رہ جاتا۔

ہمارے شہر میں ایک بزرگ حکیم تھے۔ مرض کی تشخیص کے ہنر میں بلا کے طاق! مریض کو دیکھتے ہی اس کا مرض پہچان لیتے تھے۔ ان کی مہارت کے کئی قصے زبان زد خواص و عوام ہیں، جن میں سے ایک یہ ہے کہ ایک مرتبہ ایک مریض پیٹ کے درد سے کراہتا ہوا حکیم صاحب کے پاس پہنچا۔

حکیم صاحب نے پوچھا۔ "ہاں بھئی کیا بات ہے۔ شور کیوں مچا رہے ہو؟"

"کیا بتاؤں حکیم صاحب۔ کل رات سے پیٹ میں سخت درد ہے۔" مریض نے کہا۔

"رات سے؟ کہیں تم شاعر تو نہیں ہو؟" حکیم صاحب نے کہا۔

"نہیں حضور۔ میری تو بیس پشتوں میں بھی کوئی شاعر نہیں گذرا۔ قسم لے لیجئے جو زندگی میں ایک بھی شعر کہا ہو۔" مریض نے صفائی دی۔

"تو پھر کوئی غلط سلط چیز کھائی ہو گی۔"

"غلط چیز تو کوئی نہیں کھائی، البتہ ایک جلی ہوئی روٹی ضرور کھائی تھی غلطی سے۔" مریض نے بتایا۔

"اچھا، یہ بات ہے! چلو کوئی بات نہیں۔ یہ پڑیا لے جاؤ۔ اس میں میرا بنایا ہوا خاص سرمہ سلیمانی ہے۔ روز صبح شام آنکھوں میں لگایا کرو۔ انشاء اللہ پھر کبھی پیٹ میں درد نہیں ہو گا۔"

"مریض نے حکیم صاحب سے سرمہ لیا اور ان کی ذہانت پر بہت دیر تک عش عش کرتا رہا۔

پرانے زمانے کے حکیم اور بھی ہوشیار ہوتے تھے۔ کہتے ہیں کہ جب امراء و رؤسا کی بیگمات علیل ہو جایا کرتی تھیں اور ان کی کلائی غیر مرد کے ہاتھ میں دینا معیوب سمجھا جاتا تھا تو بیگم کی کلائی میں ایک دھاگا باندھ دیتے تھے اور حکیم صاحب پردے کے پیچھے سے اس دھاگے کو پکڑ کر مریضہ کی نبض کی حرکت اور حرکت سے مرض معلوم کر لیتے تھے۔

اس سلسلے میں ایک دلچسپ قصہ بیان کیا جاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ ایک رئیس نے کسی حکیم کی ذہانت کا امتحان لینے کے لئے دھاگے کا دوسرا سرا مریضہ کے بجائے ایک بیمار بلی کے پنجے میں باندھ دیا اور پردے کے پیچھے کھڑے حکیم سے یہ کہا کہ بیگم نے کلائی میں دھاگا باندھ لیا ہے۔ حکیم نے دھاگے کا سرا ہاتھ میں لے کر کچھ دیر سوچا اور پھر بولا۔ "مریضہ نے غلطی سے کسی بیمار جانور کا گوشت کھالیا ہے!"

یہ سنتے ہی رئیس حکیم کے قدموں میں گر پڑا اور سخت تائب ہوا۔

مگر فی زمانہ تشخیص کے یہ فرسودہ طریقے ختم ہو گئے ہیں۔ ان کی جگہ جدید طریقے رائج ہو گئے ہیں جن سے بہ آسانی مرض کا پتہ چل جاتا ہے۔ ان میں سے ایک جدید طریقہ جس کا بیشتر ڈاکٹر استعمال کرتے ہیں اور جس سے چشم زدن میں مریض کے مرض کا پتہ چل جاتا ہے' یہ ہے کہ جیسے ہی مریض ڈاکٹر کے پاس آتا ہے ڈاکٹر اس سے خود ہی پوچھ لیتا ہے۔

"ہاں بھئی۔ کیا تکلیف ہے آپ کو؟"

مریض فوراً بتا دیتا ہے کہ جناب دو دن سے بخار ہے آپ نے جو سلفاڈین کی گولیاں دی تھیں ان سے ملیریئے کے آثار پیدا ہو گئے ہیں اور ٹمپریچر ایک سو چار سے نیچے نہیں اتر رہا ہے۔ قبض بھی قائم ہے اور کبھی کبھی زور کی سردی بھی لگتی ہے۔ یہ سب ملیریا کی علامتیں ہیں۔"

اس کے بعد ڈاکٹر صاحب اسٹیتھکوپ اور تھرما میٹر لگا کر مریض کی زبان دیکھتے ہیں۔ اس سے کھانسنے کو کہتے ہیں۔ اور جب انہیں پوری طرح یقین ہو جاتا ہے کہ مریض کا بیان درست ہے تو اسے ملیریا کی گولیاں دے کر ٹگڑی سی فیس وصول کر لیتے ہیں' جس میں مشورے کے پندرہ روپے بھی شامل ہوتے ہیں۔ حالانکہ ایمانداری کا تقاضہ یہ ہے کہ مشورے کی فیس انہیں خود مریض کو ادا کرنی چاہئے۔

کئی ڈاکٹر علاج تجویز کرتے وقت بھی مریض سے مشورہ کر لیتے ہیں اور اس سے پوچھتے ہیں کہ وہ کھانے کی دوا لے گا یا پینے کی' یا پھر انجکشن لگوانا پسند کرے گا؟

لیکن کئی مریض بڑے اناڑی ہوتے ہیں۔ انہیں پتہ ہی نہیں ہوتا کہ وہ کس مرض میں مبتلا ہیں۔ ایسے مریضوں کا مرض پہچاننا ڈاکٹروں کے لئے ٹیڑھی کھیر ثابت ہوتا ہے۔ چنانچہ کبھی کبھی انہیں مریض کو

اپنے ڈاکٹر ہونے کا یقین دلانے کے لئے عجیب طریقے اختیار کرنے پڑتے ہیں۔ مثلاً۔

ڈاکٹر : تمہیں ملیریا تو نہیں۔

مریض : نہیں۔

ڈاکٹر : تمہارے گھر میں تو کسی کو ملیریا نہیں؟

مریض : جی نہیں۔

ڈاکٹر : پڑوس میں؟

مریض : جی بالکل نہیں۔

ڈاکٹر : تکلیف کیا ہے؟

مریض : پتہ نہیں۔

ڈاکٹر : اچھا ذرا بان نکال کر دکھاؤ۔

مریض زبان دکھا دیتا ہے

ڈاکٹر : ارے! تمہاری زبان تو کافی لمبی ہے۔ خدا خیر کرے۔

مریض : (گھبرا کر) کیوں؟ کیا ہوا ڈاکٹر صاحب۔

ڈاکٹر : اللہ کا نام لو میاں بڑا موذی مرض ہے۔ لاؤ ذرا نبض دکھاؤ۔

مریض نبض دکھا دیتا ہے۔

ڈاکٹر : ارے! غضب خدا کا

مریض : (اور بھی گھبرا کر) کیا ہوا جناب!؟

ڈاکٹر : خدا خیر کرے اس عمر میں یہ مرض۔

مریض : (تقریباً روتے ہوئے) کچھ بتائیے تو ڈاکٹر صاحب، ہوا کیا ہے؟ ابھی تو میری شادی بھی نہیں ہوئی ہے۔

ڈاکٹر : کیا بتاؤں میاں۔ بتاتے ہوئے کلیجہ منھ کو آتا ہے۔

مریض : بتا دیجئے ڈاکٹر صاحب۔ خدا کے لئے بتا دیجئے۔

ڈاکٹر : ہائے۔ کیسے کہوں۔ تمہارے ابا میرے بڑے اچھے دوست ہیں۔

مریض : خدا کے لئے ڈاکٹر صاحب۔

ڈاکٹر : اف! کس منھ سے کہوں شرفو میاں۔ تمہاری تو.....

وہ بھی ایسے ہی ایک دور کی سچائی تھی جس کی ایک جھلک بابری مسجد کے انہدام کے بعد ہندوستان میں دکھائی دی اور جس کی یادگار اور نہیں تو کم سے کم اس مجموعے کے دو مضامین میں بڑے دل دوز پیرائے میں جاگزیں ہوگئی ہے۔ ایک "سارے جہاں سے اچھا" (حالانکہ اس کا عنوان "رہئے اب ایسی جگہ چل کر" بھی ہو سکتا تھا) جس میں میاں عبدالقدوس دل برداشتہ ہو کر آسٹریلیا ہجرت کر جانے کا ارادہ صرف نہاری کے لالچ میں ملتوی کر دیتے ہیں' اور دوسرا "اداسی" جس کے پیچھے بے پناہ کرب کا احساس چھپا ہوا ہے۔۔۔ اور کمال یہ ہے کہ قہقہوں کے پیچھے چھپا ہے۔ یہ وہ کتھارسس ہے جسے ارسطو نے ٹریجڈی میں گویا محافظ کے طور پر متعارف کرایا تھا کہ یہ سہارا بھی نہ ملے تو بقول جمیل مظہری۔

اگر نہ ہو یہ فریب پیہم تو دم نکل جائے آدمی کا

سچائی بھی یہی ہے کہ ہمارا قہقہہ یا ہلکی سی مسکراہٹ' زندگی کی چیرہ دستی کے خلاف ایک دفاعی حربہ ہے۔ بریڈلے نے شیکسپیرین ٹریجڈی کے سلسلے میں لکھا ہے کہ اگر شیکسپیئر کے المیہ کرداروں میں (مثلاً میکبتھ اور ہیملٹ میں) ذرا سی حس مزاح ہوتی تو وہ المیے سے بچ جاتے اور چڑیلوں اور بھوتوں کی باتوں کو ہنس کر ٹال دیتے۔ دراصل ان کرداروں کے المیہ ہونے کی بنیاد ہی وہ عدم توازن ہے جو ان کے ہاں حس مزاح کی کمی سے پیدا ہوا ہے۔

اور یہ کوئی ادبی تنقید کا مفروضہ نہیں عملی زندگی کی سچائی ہے۔ تقسیم کے بعد کے ہندستان میں اقلیتوں پر جو کچھ گزری ہے خاص طور پر اردو اقلیت پر جو بیتی اسے برداشت کرنا اور جزوی طور پر ہی سہی اپنے ہوش و حواس برقرار رکھنا بغیر حس مزاح کے ممکن نہ تھا۔ اب یہ اور بات ہے کہ کنہیالعل کپور ہوں یا مجتبیٰ حسین' نریندر لوتھر ہوں یا بھارت چند کھنہ' فکر تونسوی ہوں یا دلیپ سنگھ' یوسف ناظم ہوں یا احمد جمال' ان میں سے اکثر کی حس مزاح قبل تقسیم کے محرکات کی پروردہ ہے اور ان پر جغرافیہ اور تاریخ کی گرفت سخت ہے۔

نصرت ظہیر کا مزاح رشید احمد صدیقی کی اصطلاح میں زود ہضم ہے اور چہرے پر مسرت نہ سہی تو رونق چھوڑ جاتا ہے کہ اس سے ہمیں اس محافظ جھوٹ کی پناہ فراہم ہو جاتی ہے جو زندگی کی تپتی دوپہر میں ہمارا پیچھا کرتا رہتا ہے۔

ہندوستان کی تلخ اور تند حقیقتوں کی آندھیوں کی زد پر مزاح کا چراغ جلانا دل گردے کا کام ہے۔۔۔ اور وہ بھی اردو میں جس کے بولنے اور جاننے والے اب صرف مرثیے کی زبان میں گفتگو کرنے کے عادی ہو گئے ہیں اور مزاح سے بھی لطف اندوز ہوتے ہیں تو ماتمی لے میں۔

قوموں اور زبانوں کے زوال کی ایک نشانی یہ بھی ہوتی ہے کہ ان کی تمام تر توانائیاں محض صرف ماتم ہونے لگتی ہیں۔ ان کے چہرے سے اعتماد تو کیا زندگی کی تمنا غائب ہونے لگتی ہے' اور سچ پوچھئے تو یہی تمنا یہی

مریض : ہاں ہاں کہئے نا...

ڈاکٹر : تمہاری تو نبض چل رہی ہے شرفو میاں!

مریض : (چیخ کر) ہائیں!! کیا کہا نبض چل رہی ہے؟ یا اللہ مدد!

اتنا کہہ کر مریض بے ہوش ہو جاتا ہے۔ اور ڈاکٹر اس کے لئے ایک لمبا سا نسخہ تجویز کرنے لگتا ہے۔

☆ ☆ ☆

وکیل

باعزت پیشوں میں ڈاکٹری کے بعد وکالت کا نام آتا ہے۔ وکیلوں کو ہمارے سماج میں ہمیشہ عزت کی نگاہ سے دیکھا گیا ہے۔ البتہ پولس کا رویہ ان کے بارے میں اکثر مختلف رہتا ہے اور وہ عام طور سے انہیں زیادہ قدر کی نگاہ سے نہیں دیکھتی۔ کئی لوگ اس کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ پولس کی نگاہ کمزور اور محدود ہوتی ہے۔ چنانچہ جس طرح عام آدمی کی آنکھیں الٹرا وائلٹ اور انفرارڈ شعاعوں کو نہیں دیکھ پاتیں اسی طرح پولس کو وکیل نہیں دکھائی دیتے۔ اور وہ کئی بار انہیں دیکھے بغیر ہتھکڑی لگا دیتی ہے، جیسے کئی سال پہلے دہلی کی تیس ہزاری کورٹس میں ایک چور وکیل کو کرن بیدی نے لگا دی تھی۔

ایک نامعلوم دانشور نے وکیل کی تعریف اس طرح کی تھی کہ جو شخص جھوٹ کو اس طرح سامنے لائے کہ وہ پوری طرح جھوٹ معلوم ہونے لگے اور سچ کو اس طرح بیان کرے کہ وہ مکمل سچ معلوم ہونے لگے، اسے وکیل کہتے ہیں۔

لیکن جس طرح ایٹم کے بارے میں ڈالٹن کی تھیوری بعد میں غلط ثابت ہوگئی تھی اسی طرح وکیل کی یہ تعریف بھی غلط نکلی۔ ایک جدید محقق نے بعد از تحقیق بسیار پتہ لگایا کہ وکیل پر تو نہیں البتہ اس کے منشی پر کبھی کبھی یہ تعریف ضرور فٹ بیٹھ جاتی ہے۔ اور وہ بھی تب جب اس کی جیب "محنتانے" سے پوری طرح گرم ہو چکی ہو۔

جہاں تک وکیل کا تعلق ہے تو ہمارے خیال سے اس کی جدید تعریف یہ ہے کہ جو شخص جھوٹ کو اسی طرح بیان کرے کہ وہ ہر طرف سے سچ معلوم ہونے لگے اور سچ کو اس طرح سامنے لائے کہ وہ پوری طرح جھوٹ نظر آنے لگے، تو اسے وکیل کہتے ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

اکبر الہ آبادی نے وکیل کی تعریف اس طرح کی تھی

پیدا ہوا وکیل تو شیطاں نے یہ کہا
لو آج ہم بھی صاحب اولاد ہوگئے

اردو طنز نگاروں کے باوا آدم نے ابلیس کا وکیل سے رشتہ کیوں قائم کیا یہ خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ کہیں اس لئے تو نہیں کہ وہ خود بھی ایک جج تھے اور وکیلوں کو انہوں نے بہت قریب سے دیکھا تھا۔

بہرکیف آج کل کے وکیلوں کو انہوں نے قریب سے دیکھا ہوتا تو شاید یہ نہ کہتے!

اس دور کے وکیلوں کو انسانی حقوق کا جتنا خیال رہتا ہے اتنا غالباً کسی اور زمانے کے وکیلوں کو نہیں رہا ہوگا۔ گاندھی، نہرو، پٹیل اور جناح کے زمانے کے وکیلوں کو بھی نہیں۔

جب بھی انسانی حقوق پر کوئی حملہ ہوتا ہے، ہمارے وکیل فوراً اس کا مقابلہ کرنے کے لئے کھڑے ہوجاتے ہیں۔ چاہے کسی وکیل کو چوری کرنے پر ہتھکڑی لگا کر عدالت لے جانے کا معاملہ ہو، یا فریق مخالف کے ساتھ مل جانے پر موکل کے ہاتھوں پٹائی کا قصہ ہو۔ وکیل کبھی کسی ظلم پر خاموش نہیں رہتا (بعض وکیل تو ظلم نہ ہونے پر بھی خاموش نہیں رہتے)۔

کچھ اور معاملے بھی ہیں جن پر وکیل بڑے خطرناک اور شدید ردعمل کا اظہار کرتے ہیں۔ مثلاً اگر حکومت غلطی سے موکلوں کی سہولت کے لئے کوئی قدم اٹھا بیٹھے اور اس سے وکیلوں کی آمدنی پر خراب اثر پڑنے کا اندیشہ ہو تو وکیل فوراً آمادہ برجنگ ہوجاتے ہیں۔ مغربی یوپی میں ہائی کورٹ بنچ بنانے کی مخالفت اور دہلی میں ماتحت عدالتوں کا مالی دائرۂ کار بڑھانے کے لئے چلائی گئی تحریکیں اس کا ثبوت ہیں۔

سوال یہ ہے کہ آخر وکیلوں کو انسانی حقوق کا اس قدر خیال کیوں رہتا ہے۔ اس کا ایک جواب یہ دیا جاتا ہے کہ وکیل صرف اپنے آپ کو انسان سمجھتے ہیں۔ سچ کیا ہے۔ ہم نہیں جانتے۔ اکبر الہ آبادی زندہ ہوتے تو شاید بتاتے۔

ہم نے ان کا شعر میاں عبدالقدوس کو سنا کر پوچھا کہ کیا اکبر الہ آبادی دور حاضر کے وکیلوں کے بارے میں یہی شعر کہتے؟''

''قطعی نہیں۔ ہرگز نہیں۔'' انہوں نے جواب دیا۔

''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ وہ صرف ایک شعر نہ کہتے!''

ایک اور موقع پر میاں عبدالقدوس نے کہا۔

''وکیلوں میں ایک بات بڑی خراب ہوتی ہے۔''

"وہ کیا؟" ہم نے پوچھا۔

"کوئی بھی بات ہو ذرا سی دیر میں وکالت پر اتر آتے ہیں۔"

دیکھا جائے تو خاں صاحب نے غلط نہیں کہا۔ سماج کا کوئی مسئلہ ایسا نہیں جو وکیلوں کی وجہ سے سلجھا ہو۔ کوئی تنازعہ ایسا نہیں جو ان کے ہاتھ میں آکر الجھا نہ ہو۔ بات صرف اتنی ہوتی ہے کہ شرف الدین نے عین پتنگ بازی کے دوران اپنے پڑوسی فخرالدین کی چھت پر کود کر ایک کٹی ہوئی پتنگ لوٹ لی تھی۔ مگر جیسے ہی اس کی بھنک کسی وکیل کو لگتی ہے یہ معاملہ دیوانی اور فوجداری مقدموں کی شکل میں عدالتوں میں پہنچ جاتا ہے اور نیچے سے اوپر تک مختلف عدالتوں میں چکر لگنے کے بعد جب تک مقدمہ کا فیصلہ ہوتا ہے تب تک شرف الدین کا مکان بک جاتا ہے، فخرالدین کی چھت گر جاتی ہے اور وکیل کرایہ کا مکان چھوڑ کر اپنی کوٹھی کھڑی کر لیتا ہے۔

وکالت کے علاوہ وکیل حضرات کو اگر کسی چیز کا شوق ہے تو وہ ہے ہڑتال! سال کے زیادہ تر دنوں میں وہ کسی نہ کسی بات پر ہڑتال کئے رہتے ہیں اور بیچ میں جو تھوڑا بہت وقت ملتا ہے اس میں وکالت کر جاتے ہیں۔ مگر حیرت کی بات یہ ہے کہ اس کے باوجود ان کی آمدنی میں کوئی فرق نہیں آتا۔ ماہرین اقتصادیات و معاشیات و سماجیات حیران ہیں کہ اگر وکیلوں کو وکالت سے اتنی زیادہ آمدنی ہوتی ہے تو وہ اتنی کم وکالت کیوں کرتے ہیں۔ انہیں تو چاہئے کہ دن رات آمادۂ وکالت رہیں اور دونوں ہاتھوں سے موکل قبضہ میں کیا کریں۔

آخر ایک روز میاں عبدالقدوس نے ہی اس راز سے پردہ اٹھایا۔ نہایت رازدارانہ لہجے میں بولے۔ "بات بات پر ہڑتال کرتے رہنے سے موکل پریشان رہتے ہیں اور موکل جتنا پریشان ہوتا ہے وکیل اتنا ہی فائدے میں رہتا ہے۔ پھر ایک دوسرا فائدہ بھی ہے۔"

"وہ کیا؟" ہم نے بھی سرگوشی میں پوچھا۔

"مقدمہ ہارنے کے لئے زیادہ محنت بھی نہیں کرنی پڑتی۔" انہوں نے اور بھی دھیمی آواز میں کہا۔

ویسے وکیلوں کی ہڑتال زیادہ لمبی ہو تو عوام الناس یعنی عام نوعیت کے عوام کا خوب فائدہ ہوتا ہے۔

دہلی والوں کو ایک مرتبہ اس کا تجربہ ہو چکا ہے۔ بات ان دنوں کی ہے جب ۱۹۸۸ میں مسز کرن بیدی نے اپنے دفتر کا گھراؤ کرنے والے وکیلوں پر لاٹھی چلوا دی تھی۔ یہ وکیل چوری کے الزام میں پکڑے گئے ایک وکیل کو ہتھکڑی لگا کر عدالت میں لے جائے جانے کے خلاف احتجاج کر رہے تھے۔ وکیلوں کو وکیل کے چوری کرنے پر کوئی اعتراض نہ تھا۔ اعتراض انہیں اس بات پر تھا کہ اسے ہتھکڑی

کیوں لگائی گئی۔ اس پر انہوں نے ڈپٹی کمشنر پولس مسز کرن بیدی کا گھیراؤ کرلیا۔ مسز بیدی گھیراؤ تڑوانے کے لئے وکیلوں کے ساتھ عام آدمی جیسا برتاؤ کر بیٹھیں اور لاٹھی چلوادی۔ بس صاحب پھر کیا تھا۔

پہلے تیس ہزاری کورٹس میں ہڑتال ہوئی۔ پھر ہائی کورٹ میں کام بند ہوا۔ اس کے بعد سپریم کورٹ کے وکیل بھی بے مدت ہڑتال پر چلے گئے۔ پورے ملک میں عدالتی کام کاج ٹھپ ہوگیا۔ پھر جب معاملہ کچھ ٹھنڈا ہوا تو باقی ملک میں تو عدالتیں کھل گئیں لیکن دہلی کی مقامی عدالتوں میں اسی طرح سناٹا چھایا رہا۔ کئی مہینے گذر گئے پھر بھی ہڑتال ختم نہیں ہوئی۔ وکیل مسز کرن بیدی کو برطرف کرانے پر تلے ہوئے تھے اور دہلی کے باسی وکیلوں کی ایک ایسی ہڑتال سے مستفیض ہو رہے تھے جو اس سے پہلے دہلی کی تاریخ میں نہیں دیکھی گئی تھی۔

زیر سماعت قیدیوں کو اس ہڑتال سے ضرور پریشانی ہوئی' کیونکہ ان کی ضمانتیں منظور نہیں ہو پا رہی تھیں۔ لیکن عام لوگ خوش تھے۔ اتنے خوش کہ ہمیں آج بھی یاد ہے ایک مرتبہ بس میں برابر کی سیٹ پر بیٹھا ہوا ایک عام آدمی اچانک زور زور سے ہنسنے لگا۔ ہم نے اتنا خوش ہونے کی وجہ دریافت کی تو وہ بندۂ عجیب بولا۔ "سنا ہے' وکیلوں کی ہڑتال اب بھی چل رہی ہے اور مستقبل قریب میں اس کے ختم ہونے کے کوئی آثار نہیں ہیں۔ ہی ہی ہی! ہاہاہا!"

ہڑتال کا سماجی زندگی پر اتنا زبردست اثر پڑا کہ ہر طرف امن چین ہوگیا۔ پڑوسی آپس میں جھگڑتے مگر فوراً ہی صلح کرلیتے کہ عدالتیں تو بند تھیں! میاں بیوی کے جھگڑے رک گئے' طلاقوں کا سلسلہ بند ہوگیا' جائدادوں سے متعلق تنازعے لوگ خود ہی حل کرنے لگے' مکان مالک اور کرایہ دار سکون سے رہنے لگے اور یہ سب اس لئے تھا کہ وکیلوں نے وکالت بند کر رکھی تھی!

ایک جگہ تو ہم نے یہ منظر بھی دیکھا کہ چوک میں لوگ ایک دوسرے سے بغل گیر ہو رہے ہیں اور ایک وکیل اپنے مکان کے چھجے پر کھڑا اداسی سے کف افسوس مل رہا ہے!

اور جانتے ہیں اس تاریخی ہڑتال کا سب سے زیادہ فائدہ کسے ہوا؟ جی ہاں' مسز کرن بیدی کو۔ انہوں نے موقع غنیمت جان کر قانون کی تعلیم مکمل کرلی اور وکالت کا امتحان پاس کرلیا!

☆ ☆ ☆

انصاف تیرا دیکھا...

لیجئے صاحب' حد ہوگئی۔ سپریم کورٹ نے ایک چمپانزی کے ساتھ انصاف کردیا ہے۔۔

چمپانزی کو' جس کا نام جمبو ہے' ایک سرکس کمپنی تین سال پہلے اس وقت زائرے سے لائی تھی جب وہ خود بھی تین سال کا تھا۔ معاف کیجئے' زائرے ایک افریقی ملک ہے اس سے زیادہ ہم اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ ہوسکتا ہے وہاں کے لوگ زیارت گاہوں کی زیارت کا بے حد شوق رکھتے ہوں اور ملک میں زائرین کی اکثریت ہو۔ یہ بھی ہوسکتا ہے وہاں کے لوگ کھانے میں زیرہ زیادہ ڈالتے ہوں اور حد درجہ زیرک واقع ہوئے ہوں اور اس وجہ سے ملک کا نام زائرے پڑگیا ہو۔ ہم اس سلسلے میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتے۔ کیونکہ جب دنیا میں ہونولولو اور ٹمبکٹو بظاہر کسی معقول وجہ کے بغیر ہوسکتے ہیں تو کچھ بھی ہوسکتا ہے۔

خیر' سرکس کا ملازم کئی طرح کے طوطوں اور دوسرے جانوروں کے ساتھ جمبو کو لے کر ہندستان پہنچا تو اسے (ملازم کو) کسٹم والوں نے تھام لیا اور پوچھا--- بتا تیری رضا کیا ہے اور سونا کہاں چھپایا ہے؟

اتفاق سے جس کسٹم آفیسر نے یہ سوال کیا تھا' اس کی مونچھیں بڑی خوفناک تھیں اور ناک کے دونوں طرف دور دور تک پھیلی ہوئی تھیں۔ انہیں دیکھ کر جمبو اور ملازم دونوں ڈر گئے اور ایک دوسرے کے پیچھے چھپنے کی کوشش کرنے لگے۔

ملازم نے ڈرتے ڈرتے جواب دیا' جناب میں دوبئی سے نہیں افریقہ سے آرہا ہوں اور وہاں سے

ے یہ واقعہ جولائی ۱۹۹۲ء کا ہے۔

لوگ سونا نہیں جانور لاتے ہیں۔

افسر بولا۔ ''ہمیں بے وقوف بناتے ہو؟ ہمارے ملک میں کیا کم جانور رہتے ہیں۔ جلدی بتاؤ۔ سونا تم دونوں میں سے کس کے پیٹ میں ہے؟''

ملازم نے بہتیرا سمجھایا' سرکس کے کاغذات دکھائے' جانوروں کی خریداری کے بل پیش کیے لیکن افسر کو اطمینان نہ ہوا۔ اس نے ملازم سمیت تمام جانوروں کو میٹل ڈیٹیکٹر کے نیچے سے گذارا اور جب کچھ بھی برآمد نہ ہوا تو شرمندگی اور افسوس کے مارے اس کی مونچھیں لٹک گئیں جنہیں دیکھ کر جمبو اور بھی ڈر گیا۔

چونکہ ایک آدمی بغیر کچھ دیئے اس کے ہاتھ سے نکلا جارہا تھا اس لیے افسر نے ملازم کو چھوڑ کر جمبو کو پکڑ لیا اور بولا۔ چمپانزی درآمد کرنا غیر قانونی ہے اس لیے ہم اسے ضبط کرتے ہیں۔

چمپانزی کی سمجھ میں خاک نہ آیا اور وہ ہونقوں کی طرح کسٹم آفیسر کے منہ کو تکتا رہا۔ بات اس کی سمجھ میں تب آئی جب کسٹم افسر اسے چڑیا گھر پہنچانے کے لیے اس کا ہاتھ پکڑ کر لے جانے لگا۔ جب وہ لابی سے گذر رہا تھا تو لوگ یہ دیکھ کر بڑے حیران ہوئے کہ ایک بڑا چمپانزی چھوٹے چمپانزی کو لے کر کہاں جارہا ہے؟

بہرکیف۔ اس طرح جمبو سرکس کی بجائے چڑیا گھر پہنچ گیا۔ یہ بات سرکس والوں کے لیے ناقابل برداشت تھی۔ چنانچہ انہوں نے کسٹم والوں پر مقدمہ دائر کردیا۔

مقدمہ عدالت میں پہنچا تو فاضل ججوں نے سرکس کے وکیل سے پوچھا کیوں بھئی چمپانزی تو چڑیا گھر میں ہے' تمہیں کیا تکلیف؟ جانور چڑیا گھر میں رہے تو زیادہ آرام سے رہتا ہے کیونکہ چڑیا گھر کے لوگ جانور کو جانور بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس کے برعکس اگر چمپانزی کو سرکس کے حوالے کردیا جائے تو وہاں اسے انسان بنانے کی کوشش کی جائے گی جس سے اسے زیادہ تکلیف ہوگی!

یہ دلیل سن کر وکیل بغلیں (اپنی) جھانکنے لگا۔ مگر آخر کو وکیل تھا اس لئے وکالت پر اتر آیا۔

بولا۔ ''وہ تو ٹھیک ہے می لارڈ' مگر سوال تکلیف کا نہیں زندگی کا ہے۔ پچھلے دنوں چڑیا گھر میں آوارہ کتوں نے گھس پیٹھ کرکے کئی ہرن چٹ کرلئے اور درجنوں بطخیں کھا گئے۔ وہاں چمپانزی کی زندگی کی کیا گارنٹی ہے۔''

ججوں نے کہا' ہم اسے دوسرے چڑیا گھر میں بھیج دیں گے۔

وکیل بولا۔ ''مگر دوسرے چڑیا گھر کے بارے میں سنا ہے کہ وہاں چڑیا گھر کے منتظمین ہی جانور پکا کر کھا جاتے ہیں۔ بلکہ کچھ لوگ تو جانور کا گوشت بیچ بھی دیتے ہیں۔''

لیکن جج بھی پکے تھے۔ بولے' ''کوئی بات نہیں۔ ہم اسے تیسرے چڑیا گھر بھیج دیں گے۔ وہ

دوسرے سے بھی بڑا ہے۔"

"لیکن حضور۔" وکیل نے کہا' "تیسرے چڑیا گھر میں تو دہشت گردوں کے انڈے' معاف کیجئے اڈے ہیں۔ وہ آدمی کو زندہ نہیں چھوڑتے بھلا چمپانزی کو کیسے بخش دیں گے۔"

چونکہ ملک میں چڑیا گھروں کی کمی نہیں' اس لیے جج چاہتے تو جرح کو آگے بڑھا سکتے تھے۔ مگر وکیل جرح کا پکا نظر آرہا تھا اس لیے انہوں نے مزید جرح ترک کی اور اس مرتبہ خود بغلیں جھانکنے لگے (وکیل کی)۔

خوب جھانکنے کے بعد انہوں نے کہا' "اچھی بات ہے۔ تم چمپانزی کو چڑیا گھر سے لے جاسکتے ہو۔ لیکن خبردار۔ اپنے موکل کو سمجھا دینا۔ سرکس میں اس کے ساتھ انسانی سلوک نہ کیا جائے۔ اگر ایسا ہوا تو ہم چمپانزی کو ایذا پہنچانے کے جرم میں موکل کو چڑیا گھر بھیج دیں گے۔"

"انسانی سلوک کی وضاحت فرمائی جائے می لارڈ۔" وکیل نے سر جھکا کر کہا۔

جج بولے۔ "انسانی سلوک کا مطلب ہے وہ سلوک جو ایک انسان دوسرے انسان کے ساتھ کرتا ہے! انڈر اسٹینڈ۔"

یہ سن کر وکیل مسکرانے اور موکل تھر تھر کانپنے لگا کہ وہ اچھی طرح جانتا تھا' انسان انسان کے ساتھ کیسا سلوک کرتا ہے!

اگلے روز اس واقعہ پر ہم نے میاں عبدالقدوس سے تبادلہ خیالات کیا۔ ہم نے کہا "ہمارا عدالتی نظام بھی خوب ہے۔ اب تو بندروں کو بھی انصاف ملنے لگا ہے۔"

انہوں نے افسوس سے سر ہلاتے ہوئے فلم آشیرواد کا مشہور مکالمہ دوہرایا۔ "یہ سرکار زیادہ دن نہیں چلے گی۔"

"مگر ہم سرکار کی نہیں بندروں کی بات کر رہے ہیں خاں صاحب۔ بندروں کا سرکار سے کیا تعلق؟" ہم نے کہا۔

"تعلق کیوں نہیں۔ تعلق ہے بھئی اور آج کا نہیں کروڑوں سال کا تعلق ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ سرکار آدمی چلاتے ہیں اور آدمی کے بارے میں ڈارون کی تھیوری کیا ہے یہ تم جانتے ہی ہوگے۔ مگر خیر' تشویش کی بات یہ نہیں کہ عدالتوں سے بندروں کو انصاف ملنے لگا ہے۔ تشویش کی بات یہ ہے کہ عدالتوں سے انصاف ملنے لگا ہے۔ انصاف کا ملنا ہر دور کے لیے تشویشناک ہوتا ہے۔ اگر ہماری عدالتوں نے انصاف ڈھالنا شروع کر دیا تو سارا نظام تہ و بالا ہو جائے گا۔ ذرا سوچو۔ آج بندروں کو انصاف مل رہا ہے۔ کل انسانوں کو بھی مل سکتا ہے۔"

"یہ تو بہت اچھا ہوگا۔" ہم نے رائے دی۔

"اچھا!؟ میرے عزیز سچ یہ ہے کہ اس سے زیادہ خطرناک تو کوئی بات ہی نہیں ہوسکتی۔ خدا نہ خواستہ، دشمنوں کے کان بہرے، دیکھنے والے کا منہ کالا ہو، اگر انسانوں کو انصاف ملنے لگا تو جلد ہی سب کچھ ملیامیٹ ہوجائے گا۔"

"معاف کیجئے خاں صاحب۔ آپ کی یہ منطق ہماری سمجھ سے باہر ہے۔" ہم نے کہا۔

"اخبار والے ہو نا۔ اس لیے" انہوں نے اپنا محبوب تبصرہ دوہرایا۔ پھر سمجھاتے ہوئے بولے۔

"عزیز من۔ ذرا غور کرو اور غور کرنے سے جو نتیجہ برآمد ہو اس پر دوبارہ غور کرکے یہ دیکھو کہ آج صورت حال کیا ہے؟ آج حالت یہ ہے کہ قصوروار پکڑا جاتا ہے، عدالت اسے بری کردیتی ہے۔ بے قصور پکڑا جائے تو ریمانڈ پر جیل میں لٹکائے رکھتی ہے۔ پھر جب انصاف ہوتا ہے تو قصوروار کو شک کا فائدہ ملتا ہے اور بے قصور کو شبہ کا نقصان۔ اس دوران وکیل نئی کوٹھی کھڑی کرلیتا ہے۔ پیش کار کی تجوری بھرتی جاتی ہے۔ وکیلوں کے منشیوں اور عدالتی کارندوں کا روزگار چلتا رہتا ہے۔ پھر پولس والے ہیں۔ سیاسی لیڈر ہیں۔ مذہبوں کے ٹھیکیدار ہیں۔ ان کا پیٹ بھی عدالتوں سے ملنے والی ناانصافیوں سے ہی بھرتا ہے اور اس طرح ناانصافیوں کے بل پر پورے سماج میں ایک توازن بنا رہتا ہے۔ اگر عدالتوں سے تمام انسانوں کو انصاف ملنے لگا تو جانتے ہو کیا ہوگا؟"

"کیا ہوگا؟" ہم نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"اجودھیا جیسے تنازعے ختم ہوجائیں گے۔ جس سے مذہبی ٹھیکیداروں کی سیاسی دکان داری ٹھپ ہوجائے گی۔ شیئرز اسکینڈل اور شوگر اسکینڈل جیسے معاملے انصاف سے نپٹنے لگیں گے۔ جس سے سیاسی پارٹیوں کا دھندا چوپٹ ہوجائے گا۔ پھر جب مجرم کو سزا اور معصوم کو رہائی ملنے لگے گی تو پولس ڈپارٹمنٹ کا دیوالیہ نکل جائے گا اور وکیل، منشی پیش کار، سب کے سب بھوکوں مرنے لگیں گے۔ سماج کا سارا بیلنس الٹ پلٹ ہوجائے گا۔ یوں سمجھو میرے عزیز کہ اگر عدالتیں انسانوں کے جھگڑوں کا پورے انصاف کے ساتھ انصاف کرنے لگیں تو ایک دن لوگ آپس میں لڑنا ہی بند کردیں گے اور اگر لڑائی جھگڑے بند ہوگئے تو....."

"تو؟" ہمارا دل دھڑکنے لگا۔

"دنیا کے آدھے لوگ چین سے رہنے لگیں گے۔"

"اور باقی آدھے؟" ہمارا دل اور تیزی سے دھڑکنے لگا۔

"باقی آدھے انہیں چین سے پاکر خود بھی سکون سے رہنے پر مجبور ہوجائیں گے!"

☆ ☆ ☆

شاعر صحافی اور مجاور

کہتے ہیں، جو کچھ نہیں بن پاتا قدرت اسے شاعر بنا دیتی ہے اور وہ چاء خانہ ہو یا کسی کی دعوت ولیمہ پر ہونے والی شعری نشست، ہر جگہ ترنم سے غزلیں سنانے لگتا ہے۔

اس سے آگے میاں عبدالقدوس کا کہنا ہے کہ جو شاعر بھی نہیں بن سکتا وہ صحافی بن جاتا ہے، جیسے تم! (تم، یعنی ہم)

"اور جو صحافی بھی نہ بن سکے وہ؟" ہم نے ایک دن پوچھا۔

"اسے چاہئے کہ وہ جنگل کا رخ کرے یا پھر کوئی نوگزہ مزار ڈھونڈ کر مجاوری شروع کردے۔" انہوں نے پاکٹ جنتری میں اس مہینے پڑنے والے عرسوں کی تاریخیں نوٹ کرتے ہوئے کہا۔

اسی قول کو میاں عبدالقدوس ایک مرتبہ یوں بھی کہہ چکے ہیں کہ "ہر ناکام شاعر اچھا صحافی ثابت ہوتا ہے اور ہر ناکام صحافی کامیاب مجاور بن جاتا ہے۔"

ہم نے پوچھا "مثلاً؟" تو کہنے لگے "اس کا جواب مکمل چکرورتی اور ایم جے اکبر بہتر طور سے دے سکتے ہیں[1] اور اس معاملے میں میرا منہ بند ہی رہے تو بہتر ہے۔ خاص طور سے تمہارے حق میں۔"

"وہ کیوں؟"

---

[1] یہ ان دنوں کی بات ہے (غالباً ۱۹۸۹ء کی) جب مکمل چکرورتی کو اعلیٰ صحافت کا ایوارڈ ملا تھا اور ایم جے اکبر صحافت چھوڑ کر پارلیمنٹ کے ممبر اور کانگریس کے ترجمان بن گئے تھے۔